حیات حافظ

تحریر: مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری (مرحوم)

دیباچہ طبع چہارم ۱۹۸۲ء

حیاتِ حافظ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم نے ۱۹۰۹ء میں مکمل کی جب کہ وہ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ملازم تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے خواجہ حافظ شیرازی کی زندگی کے حالات کے ساتھ ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ بھی لکھا تھا۔

اس وقت تک حافظ سے متعلق انگریزی اور فارسی میں جس قدر کتابیں (مطبوعہ و قلمی) دستیاب تھیں، جو مشہور تذکرے مل سکتے تھے اور دیوان حافظ کے جو قلمی اور مطبوعہ نسخے فراہم ہو سکتے تھے، ان میں سے بیشتر ان کے سامنے تھے۔ یہ آج سے ۷۳ سال پہلے کی بات ہے۔

ہمارے سامنے حیات حافظ کا جو نسخہ ہے وہ مطبع فیض عام، علی گڑھ میں ۱۳۳۹ = (۲۱_۱۹۲۰ء) میں چھپا تھا اور یہ اس کا تیسرا ایڈیشن تھا۔ اس میں سیکڑوں حافظ کے اشعار ہیں جن سے ان کی زندگی کے حالات مرتب کرنے میں مدد لی گئی ہے، پھر انھیں اشعار کے سہارے ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے ان اشعار کو ہم نے پڑھا تو محسوس ہوا کہ کہیں کہیں الفاظ و تراکیب ایسی ہیں جن سے شعر کی لطافت و نزاکت میں بال آ گیا ہے اور جب ہم نے محمد قزوینی اور دکتر قاسم غنی اور دکتر جلالی نائینی و دکتر نذیر احمد کے ایڈٹ کیے ہوئے نسخوں سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا احساس اور اندازہ صحیح تھا۔ قزوینی اور نائینی کے نسخے، باوجودیکہ ان دونوں میں بھی کہیں کہیں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے، بلاشبہ دیوان حافظ کے تمام نسخوں کے مقابلے میں مستند و معتبر کہے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم نے انھیں دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر حیات حافظ کے اس تیسرے ایڈیشن میں درج اشعار حافظ کی تصحیح کر دی ہے اور جا بجا حاشیے بھی لکھ دیئے ہیں۔ اس طرح سعدی شیرازی کے اشعار کی تصحیح بھی مظاہر مصفا کے ایڈٹ کیے ہوئے متن کامل دیوان شیخ اجل سعدی شیرازی (کانون معرفت، تہران، لالہ زار، خرداد ماہ ۱۳۴۰ خورشیدی) کے مطابق کی گئی

ہے۔عزیز دولت آبادی نے کمال الدین مسعود خجندی کے جو اشعار حیات حافظ میں نقل کیے گئے ہیں، ان کو بھی عزیز دولت آبادی کے مرتب کیے ہوئے متن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔رودکی کے پانچ شعر مولانا نے حیات حافظ میں دیئے ہیں ۔لیکن یہ اشعار ذبیح اللہ صفا کی تاریخ ادبیات در ایران اور بدیع الزماں فروزانفر کی سخن اور سخنوران میں نہیں ہیں۔معلوم نہیں مولانا کے سامنے کون سا ماخذ تھا۔ حافظ کی ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

این چه شوریست که دو دوری قمر می بینم

همه آفاق پر از فتنه و شر می بینم

اور چند دوسرے اشعار جو قزوینی اور نائینی و نذیر احمد کے نسخوں میں نہیں ہیں، اسی طرح باقی رکھے گئے ہیں جیسے کہ وہ کتاب میں تھے۔ہوسکتا ہے کہ سخت دیدہ ریزی کے بعد بھی بعض مقامات پر ہم سے فروگذاشت ہوگئی ہو، امید ہے کہ اسے نظر انداز کیا جائے گا۔

ضیاءالحسن فاروقی

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء

ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

۱۹۰۸ء میں بڑی تعطیل کے بعد جب مدرسہ کھلا تو میں نے اپنی ہمت کی کمر چست باندھی اور ایک نئی تصنیف کے بیابان میں جس کا نام کعبہ یا بیت اللہ ہوگا، قدم رکھا اور چلنا شروع کیا مگر راستہ اس قدر دشوار گذار ملا کہ ابھی کچھ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ صحت نے بھی رفاقت چھوڑنی چاہی۔ بعض دوستوں نے صلاح دی کہ اس کو تھوڑے دنوں کے لیے ملتوی کردو لیکن شوق کے پانو نہیں رکتے تھے اور دل کہتا تھا:

در بیاباں گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

مگر ہمت کہاں تک کام دیتی۔ آخر چند روز کے بعد صحت نے بالکل ہی ساتھ چھوڑ دیا اور مجبوراً رخت سفر کھولنا پڑا۔

پورے ایک چلہ کے بعد پھر حالت سنبھلی اور پانو میں کچھ طاقت آئی لیکن اب اس لق و دق صحرا میں قدم رکھنے سے جی ڈرتا تھا۔ دوسری طرف رخ کیا۔ اتفاقاً سامنے ہی ایک پرفضا باغ نظر پڑا۔ یہ خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری کا باغ تھا۔ اس کی رنگینی و لطافت نہایت دل فریب اور دلکش معلوم ہوئی اور جذبۂ شوق بے ساختہ اس کی طرف کھینچ کرلے گیا۔

اب بجائے کہ اس کے کہ کعبہ کا مسافر عرب کی صحرا نوردی کرتا، شیراز کے گل گشت مصلےٰ اور آب رکناباد کی تفریح میں مشغول ہوگیا۔ خوش قسمتی سے حافظ جیسا زندہ دل اور پرمایہ میزبان ملا جس کی غزل کی دو آتشہ شراب کے جام پیالے پینے شروع کیے اور مزے لے لے کر یہ کہنے لگا:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلاً را

ہر چند کہ میرے دوستوں نے میری اس بد تکلفی کو تعجب سے دیکھا اور ''لبیک'' کے نعرے کے بجائے میرے لبوں سے ''ہات الصبوح'' کا شور سن کر مجھے ملامت کرنے لگے لیکن ان دلچسپیوں میں میں کچھ ایسا محو ہو گیا تھا کہ ان باتوں کی مجھے کچھ پروا نہیں ہوتی تھی، اگر کچھ خیال بھی ہوتا تھا تو دل کہتا تھا:

شیوۂ رندی نہ لائق بود امّا ایں زماں
چون در افتادم چرا اندیشۂ دیگر کنم

آخر تین دن کے بجائے تین مہینے اس مہربان میزبان کے باغ میں نہایت لطف کے ساتھ گزارے، اسی اثنا میں دوستوں کے لیے بھی اس میں سے ایک گلدستہ تیار کیا جس کو اس ناچیز تصنیف کی شکل میں پیش کرتا ہوں،

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اسلم جے راج پوری

مدرستہ العلوم علی گڑھ

مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۹ء

تمہید

گذشتہ زمانے میں جس شخص کو کسی ایسی چیز میں کمال حاصل ہوتا تھا جس سے عوام کو بھی دلچسپی ہو تو اس کے متعلق طرح طرح کی عجیب وغریب روایتیں گھڑی جاتی تھیں جو اس کے تذکرے کو دلچسپ بنانے کے لیے ہر ایک محفل میں بطور نقل مجلس کے استعمال کی جاتی تھیں۔

اس میں کچھ ایشیا ہی کی خصوصیات نہیں تھی بلکہ اہل یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ ہومر کی الیڈ را اور اڈیسی جب بہت مقبول ہوئیں تو اس کی طرف ایسی ایسی روایتیں منسوب کی گئیں جن کو دیکھ کر بعض مورخوں نے یہ کہا کہ ہومر کوئی شخص ہی نہیں گزرا اور یہ نام فرضی ہے۔

اسی طرح لیلی مجنوں کے عشق کے قصے ہیں۔ جس نے محبت کا کوئی دلچسپ لطیفہ سوچا انھیں کی طرف منسوب کر دیا۔ ہندوستان میں خسرو اور بیربل ظرافت کے لیے نامزد ہو گئے ہیں۔ عوام نے ہزارہا لطیفے ان کے نام سے گھڑ لیے ہیں۔

خواجہ حافظ جن کی غزل شاعرانہ کمال کی آخری حد اور انسانی طبیعت کے لیے ایک لطیف روحانی غذا ہے، اس کلیہ سے کیوں کر مستثنٰی رہ سکتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کی شاعری انسانی فطرت سے بالاتر سمجھی گئی، کسی نے ان کو خضر کا شاگرد بتایا، کسی نے ملہم سمجھا، کسی نے مجذوب صوفی کہا، کسی نے رند مے پرست اور عاشق مزاج ٹھہرایا اور اس قسم کی طرح طرح کی روایتیں ان کی طرف منسوب کی گئیں۔ یہی مجلسوں میں بیان ہونے لگیں اور کتابوں میں لکھی جانے لگیں۔ ان طلسمی حکایتوں کے مقابل میں ان کی زندگی کے اصل حالات اور واقعات کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی اور زمانے کی موجیں اپنے ساتھ ساتھ ان کو لیتی گئیں۔

خواجہ کے اندر دو قسم کے کمال تھے، یعنی ایک تو وہ نہایت بزرگ صوفی تھے، دوسرے بہت بڑے شاعر۔ ان دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ ان کے متعلق لکھا جانا

چاہیے تھا۔ ہم نے جس وقت ان کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شعرا کے تذکرے دیکھے، صوفیہ اور مشائخ کے حالات پڑھے، بہت سی تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، مگر سوائے تھوڑے سے حالات اور چند خرافات حکایتوں کے اور کچھ نہ ملا۔

فارسی کی معمولی کتابیں جن میں خواجہ کے کچھ حالات مل سکے، یہ ہیں:

نفحات الانس، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، سفینۃ الاولیا، آتش کدہ، خزانہ عامرہ، روضہ الصفا، حبیب السیر، مفتاح التواریخ وغیرہ۔

تاریخ فرشتہ اور تاریخ نادری میں بھی کہیں کہیں بعض بعض قصے ضمناً آ گئے ہیں۔ انگریزی میں جو تصنیفات فارسی ادب یا خود خواجہ کے متعلق ہوئی ہیں ان میں سے بھی اکثر کتابیں ہم نے دیکھیں، مثلاً مسٹر براون کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا، لوُسا کی روز گارڈن آف پرشیا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، گوراوسلی کے بایوگریفکل نوٹس آن پرشین پوئیٹس، کپتان کلارک کا دیوان حافظ کا ترجمہ، ولیم جونس کا ترجمہ، بکنل کا ترجمہ انتخاب۔ مگر ان میں بھی وہی قصے اور وہی روایتیں کسی قدر زیادہ آب تاب کے ساتھ مندرج ہیں۔ اسی زمانے میں ہم نے سنا کہ ڈاکٹر گاتھیل نے جو امریکا کی کولمبیا یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں ''دروَرلڈس گریٹ کلاسکس'' کے سلسلے میں فارسی ادب پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ بڑی جستجو سے اس کو حاصل کیا اور خواجہ کے حالات پڑھنے شروع کیے مگر ہم کو یہی امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا یہ کتاب جس کو ہم پڑھ رہے ہیں کوئی تاریخ ہے یا ناول ہے۔

اسی اثناء میں ہم کو ایک گنج مخفی کا پتہ لگا، یعنی دہلی کے نواب احمد سعید خاں صاحب نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو بہت سی کتابیں دی ہیں جو کتب خانے سے الگ محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے سیکڑوں کتابیں جو زیادہ تر قلمی اور پرانے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں فارسی ادب اور تاریخ کے متعلق ہیں۔ ہم نے اس بیش بہا ذخیرے کو بھی چھان ڈالا۔ کئی ایک نئے تذکرے اور نئی تاریخیں ملیں۔ لیکن ان

معلومات میں جو خواجہ کے متعلق ہم کو پہلے سے حاصل تھیں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔

ان تذکروں میں سے ایک تذکرہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ اس کا نام ہے تذکرہ پنڈت خوشگر۔ افسوس ہے کہ شروع اور آخر کے بہت سے ورق نہیں ہیں اس وجہ سے اس لائق پنڈت کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

اس پر ۱۸۶۳ء کی ایک یادداشت لکھی ہوئی ہے کہ گنجے نوعلی تمباکو فروش سے پندرہ آنے میں خرید کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسی تمباکو فروش نے اس کے بیش قیمت ورقے پڑیوں میں صرف کیے ہوں گے۔

تمام تذکرے کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ پنڈت کا تخلص عیشی ہے اور وہ پٹنہ کا رہنے والا ہے، زندہ دل پنڈت اپنے آپ کو خواجہ کا روحانی شاگرد سمجھتا ہے۔ اس نے کسی شاعر کا حال چار سطروں سے زیادہ میں نہیں لکھا ہے۔ لیکن خواجہ کے حالات ایک جزو پر بھی تمام نہیں ہوئے۔ وہ خواجہ کا نہایت عقیدت مند ہے اور یہ عقیدت مندی اس کو بطور میراث ملی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میرے دادا جو جہاں زیب بانو بیگم بنت شاہزادہ داراشکوہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ہر وقت دیوان حافظ بغل میں رکھتے تھے اور میرے باپ جو اجمیر میں شاہی توپ خانے کے افسر تھے، ہر شب جمعہ کو خواجہ کی نذر میں مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

الغرض جہاں تک ہمارے امکان میں تھا، ہم نے جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مگر پھر بھی ایسے معتد بہ حالات نہیں معلوم ہو سکے جو خواجہ کے متعلق تذکرہ لکھنے کی ہمت دلاتے۔

ابتدا ہی میں جب ہم نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا ہمارے ایک کرم فرمانے اردو کے موجودہ مصنفوں میں سے ایک ممتاز مصنف کا نام لیا کہ وہ بھی خواجہ کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے، مگر اسی وجہ سے نہیں لکھا کہ کچھ حالات نہیں مل سکے۔ اس

وقت تو ہم نے یہ جواب دیا تھا:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
مگر حقیقت میں یہ سیر آسان نہیں ہے
کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

مگر چوں کہ خواجہ کے ساتھ دن بدن دنیا کو زیادہ ذوق ہوتا جاتا ہے، اس لیے جو کچھ بھی حالات مل سکے تھے، دل نے ان کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور گو ان کی زندگی کا کوئی بڑا کارنامہ یا کوئی مفصل کیفیت نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھول نہیں تو پنکھڑی ہی سہی، انھیں کو غنیمت سمجھ کر مرتب کر لیا اور ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کی۔ امید ہے کہ احباب اس میں ہمارا زیادہ قصور نہ سمجھیں گے کیوں کہ ہم تو گذشتہ مورخین کے پابند ہیں جو حالات ان کی کتابوں میں ہم کو ملیں گے وہی ہم آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔ ہمارا تو یہ حال ہے:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استادِ ازل گفت بگو می گویم

نام ونسب اور تعلیم

خواجہ کا لقب شمس الدین، نام محمد اور تخلص حافظ ہے۔

ان کے آبا و اجداد مقام سرکان کے باشندے تھے جو شہر نہاوند کے قریب ہے۔ ان کے دادا شیراز میں آ گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

کسی تذکرے سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کیا نام تھا۔ البتہ اتنا پتہ لگتا ہے کہ وہ بڑے نیک تھے، تجارت ان کا پیشہ تھا اور شیراز میں ان کی عزت اور وقعت تھی۔

خواجہ کے والد کا نام مولانا کمال الدین تھا جو علما اور اہل کمال میں سے شمار کیے جاتے تھے اور اپنی آبائی تجارت کی وجہ سے دولت تھے۔

خواجہ کے ایک چچا بھی تھے جن کا نام سعدی تھا (یہ شیخ سعدی گلستان و بوستان کے مصنف نہیں ہیں) وہ ایک صوفی منش شاعر اور بڑے باکمال تھے۔

اس سے زیادہ خواجہ کے خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، لیکن یہ تمام مورخ لکھتے ہیں کہ ان کا گھرانا علم و فضل اور خاندانی وجاہت کے لحاظ سے شیراز میں معزز خیال کیا جاتا تھا۔

خواجہ کی پیدائش شیراز میں ہوئی۔ سنہ ولادت کا ٹھیک پتہ کسی تاریخ سے نہیں چلتا مگر یہ بات مسلم ہے کہ وہ آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں پیدا ہوئے۔

ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ تخمینہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت ۷۱۵ھ میں ہوئی ہوگی، کیوں کہ جس وقت تعلیم سے فارغ ہوئے اور شیراز میں ان کی علمی لیاقت کا شہرہ ہوا تو حاجی قوام الدین حسن وزیر نے ایک مدرسہ خاص انھیں کے لیے قائم کیا تا کہ اس میں وہ طلبہ کو فقہ و تفسیر پڑھائیں۔ یہ مدرسہ ۷۴۵ھ میں قائم ہوا تھا، اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایسی لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کے لیے جو ایک مدرسہ قائم کرنے کی سفارش کرے کم سے کم تیس سال کی عمر ہونی چاہیے۔

خواجہ چوں کہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس میں علم و فضل موجود تھا اس لیے بچپن ہی سے تحصیل علم میں لگائے گئے، پہلے انھوں نے قرآن حفظ کیا اور اسی وقت سے حافظ کہے جانے لگے۔ یہ لقب ان کو اتنا پسند آیا کہ یہی انھوں نے اپنا تخلص بھی رکھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خواجہ کا محض تخلص ہی حافظ تھا اور وہ دراصل حافظ قرآن نہ تھے۔ مگر ہم کو اس خیال پر تعجب آتا ہے۔ ہر زمانے میں لاکھوں مسلمان بچے قرآن حفظ کرتے ہیں۔ خواجہ کے حفظ قرآن سے انکار کرنے کی کیا وجہ ہے۔ علاوہ بریں اس زمانے میں شیراز ایک ایسا مقام تھا جہاں تمام اسلامی دنیا سے زیادہ قرآن خوانی کا چرچا تھا۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح جو حافظ کے زمانے میں پہلی بار ۷۲۷ھ اور دوسری بار ۷۴۸ھ میں شیراز گیا ہے، اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ ''جس ذوق وشوق اور خوش الحانی کے ساتھ شیراز کے لوگ قرآن پڑھتے ہیں، ایسا تمام دنیا میں کہیں نہیں سنا۔'' اس عام ذوق وشوق کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ وہاں کے بچوں کو زیادہ تر قرآن حفظ کرایا جاتا ہوگا۔ ایسی حالت میں حافظ جو ایک علم پرست خاندان کے بچے تھے کیوں کر اس سے محروم رہتے، خود ان کے دیوان میں جابجا بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن سے ان کے حافظ قرآن ہونے کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً ایک غزل میں لکھتے ہیں:

اے چنگ فرو بردہ بخون دل حافظ

فکرت مگر از غیرت قرآن خدا نیست

ظالم تو نے حافظ کے خون کے دل میں ہاتھ ڈبو رکھا ہے، شاید کلام الٰہی کی غیرت کا تجھے کچھ خیال نہیں ہے۔

دوسری غزل میں شعر ہے۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظؔ
بقرآنیکه اندر سینہ داری

حافظؔ میں نے تیرے شعروں سے اچھے کسی کے شعر نہیں دیکھے، اس قرآن کی قسم ہے جو تیرے سینے میں ہے۔

یہی نہیں کہ وہ معمولی حافظ تھے بلکہ تمام قرأتوں سے بھی واقف تھے اور اپنی قرآن دانی پر ان کو ناز تھا، چنانچہ کہتے ہیں:

عشقد رسد بفریاد ور خود بسان حافظؔ
قرآں بخوانی بر چار دہ روایت

عشق تیری فریاد رسی کرے اگر تو بھی حافظؔ کی طرح قرآن کو چودھوں قرأتوں کے ساتھ ازبر پڑھے۔

حفظ قرآن کے بعد خواجہ نے مولانا شمس الدین محمد عبداللہ شیرازی کے حلقۂ درس میں جو کہ بڑے مشہور فقیہ اور مفسر تھے اور دور دور سے لوگ ان کے یہاں پڑھنے کے لیے آتے تھے، تفسیر اور فقہ پڑھی۔

مولانا شمس الدین محمد حافظ کی ذہانت پر اس قدر فریفتہ تھے کہ ان کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنا لقب شمس الدین ان کو عطا کر دیا۔

بعض مورّخ لکھتے ہیں کہ خواجہ نے علامہ سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ سے جو کہ تیموری علماء میں سے ہیں منطق کی کتابیں پڑھیں لیکن یہ غلط ہے کیوں کہ علامہ سید شریف ۷۴۰ھ میں پیدا ہوئے جس کے پانچ ہی سال بعد خواجہ مسند درس پر بیٹھے۔ جو زمانہ خواجہ کے بڑھاپے کا ہے وہ ان کی جوانی کا ہے، پھر یہ کیوں کر یقین کر لیا جائے کہ خواجہ نے ان کی شاگردی کی ہوگی۔ خواجہ شروع ہی سے ذہین، فطین اور طباع تھے اس وجہ سے علوم عقلیہ مثلاً منطق فلسفہ اور فقہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور

ساتھ ہی علم ادب سے بھی بہت ذوق تھا۔ زیادہ تر شعرا ے جاہلیت کے دواوین کی جستجو میں رہتے تھے۔ سکاکی کی کتاب مفتاح جو معانی و بیان میں ہے اکثر میں اپنے مطالعے میں رکھتے تھے۔

مگران کے تمام علمی ذوق کا مرکز دراصل قرآن تھا کیوں کہ علوم قرآنیہ کے ساتھ ان کو شغف تھا۔ اوراکثر وہ تفسیروں کا درس دیا کرتے تھے۔ کشاف جو قرآن کی ایک معرکتہ آلا را تفسیر اور علامہ زمحشری کی تصنیف ہے، ان کو تمام تفسیروں سے زیادہ مرغوب تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایک حاشیہ بھی اس پر عربی زبان میں لکھا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ معقول اور منقول پر بھی حاوی تھے اور معتزلہ کے عقلی مباحث کو دل چسپی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اگر چہ خواجہ کے زمانے سے تقریباً ایک صدی پہلے تاتاری حملے نے اسلامی جاہ و جلال کو اپنی خوں فشاں موجوں میں غرق کر دیا تھا مگر خدا کی قدرت کے عجیب کرشمے ہوتے ہیں، وہی حملہ آور کچھ مدت کے بعد مسلمان ہو گئے جس کی وجہ سے اسلام کی خشک رگوں میں پھر ایک تازہ خون دوڑ گیا اور علوم اسلامیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ پھر روشن ہو گئے۔

خواجہ کے زمانے میں تاتاری خاندان کا آخری بادشاہ ابوسعید خاں بغداد کے تخت پر رونق افروز تھا جو بڑا عادل، پرہیز گار اور علم پرست تھا۔ اس کے زمانے میں شیراز کے مردم خیز خطے میں جہاں ہمیشہ سے بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوتے چلے آئے تھے ایک جماعت ایسے اہل کمال کی موجود تھی جن کی نظیر اس دنیا میں تمام دنیائے اسلام میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ مثلاً قاضی مجد الدین اسمٰعیل، قاضی عضد مولانا بہاء الدین وغیرہ جن کی تصنیفات اور کارنامے قیامت تک مقبول اور یادگار رہیں گے۔

حاجی قوم الدین حسن نے جو شاہ ابو اسحاق والی شیراز کے وزیر اور بڑے علم

دوست تھے، خواجہ کی استعداد کو دیکھ کر ان کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تا کہ وہ فقہ اور تفسیر کا درس دیں۔

شاعری کی ابتدا

فارس اور خاص کر شیراز میں شاعری کا مذاق عام تھا۔ بادشاہ اور فقیر، عالم اور جاہل، بڈھا اور جوان غرض ہر شخص کچھ نہ کچھ اس کا چسکا رکھتا تھا۔ خواجہ جن کو فطرتاً چلبلی اور شاعرانہ طبیعت ملی تھی، اس سے کیوں کر الگ رہ سکتے تھے۔ بچپن ہی سے ان کو بھی اس کا شوق دامن گیر ہوا۔

خواجوا کرمانی جو نہایت لطیف و ظریف شاعر اور صوفی منش آدمی تھا۔ اس زمانے میں شیراز ہی میں تھا۔ خواجہ اکثر اس کی صحبت میں بیٹھتے اور شاعرانہ رموز و نکات اس سے حل کرتے۔

علاوہ بریں خود ان کے چچا سعدی بہت اچھے شاعر تھے اور ان کے جلسوں میں اکثر شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ بچپن ہی کے زمانے کا قصہ ہے کہ ان کے چچا سعدی ایک مکان میں بیٹھے ہوئے کوئی صوفیانہ غزل لکھنی چاہتے تھے۔ ابھی انھوں نے ایک ہی مصرع لکھا تھا کہ کسی ضرورت سے ان کو باہر جانا پڑا۔ کاغذ وہیں چھوڑ گئے۔ خواجہ نے ایک مصرع لکھا ہوا دیکھ کر اس پر دوسرا مصرع لگا کر شعر پورا کر دیا۔ سعدی جب باہر سے آئے تو پورا شعر لکھا ہوا دیکھ کر حیرت میں ہو گئے اور خواجہ سے پوچھا کہ تم نے دوسرا مصرع لگایا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا اچھا تمھیں اس غزل کو پوری کر دو۔

خواجہ نے تھوڑی دیر میں غزل پوری کر دی اور ایسی اچھی کہی کہ سعدی اس کو دیکھ کر متحیر ہو گئے اور وجد میں آ گئے۔ پھر خواجہ سے کہا جا! تو ایسا شاعر ہو گا کہ جو تیرے اشعار سنے گا۔ وہ مجذوب اور مخبوط الحواس ہو جائے گا۔ کپتان کلارک لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے ترک اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ سعدی کی دعا کا اثر خواجہ کے

کلام میں ہے کہ جو اس کو پڑھتا ہے بے خود اور مجذوب ہو جاتا ہے۔

بعض تذکرہ نویس خواجہ کی شاعری کے متعلق یہ عجیب و غریب حکایت لکھتے ہیں کہ شیراز سے چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ جس کا نام پیر سبز تھا۔ وہ ایک پہاڑ کے ٹیلے پر واقع ہے جو باباکوہی کے نام سے مشہور ہے۔ فارس میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص اس مقام پر ایک چلہ کھینچے حضرت خضر اس کو آب حیات پلا دیتے ہیں اور وہ اعلا درجے کا شاعر ہو جاتا ہے۔ خواجہ نے بھی اسی ارادے سے چلہ کشی شروع کی۔ روزانہ رات کے پچھلے پہر وہاں جاتے۔ ورد اور وظیفہ پڑھتے۔ اسی زمانے میں ان کو ایک بازاری عورت شاخ نبات نامی سے عشق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک دن رات کو اس کے کوچے میں چلے گئے اور وہی چلہ کی چالیسویں رات تھی۔ شاخ نبات کہاں تو کبھی التفات ہی نہیں کرتی تھی اور کہاں آج بڑی لگاوٹ کی باتیں شروع کیں۔ خواجہ بھی اس کی باتوں میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ چلے کا خیال ہی دل سے جاتا رہا۔ جب رات زیادہ آ گئی تو یکا یک خیال آیا، گھبرا کر اٹھے۔ اس نے ہر چند روکنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور پیر سبز پہنچ کر حسب معمول وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کی اس مستعدی پر خدا کو رحم آیا۔ حضرت خضر نمودار ہوئے اور انھوں نے آب حیات کا پیالہ پلا دیا۔ اسی دن سے ان کو ایک غیر فانی شاعری مل گئی۔ صبح کو حسب حال یہ غزل لکھی:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوش دل چہ عجب
مستحق بودم و اینہا بزکاتم دادند

باتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد
کہ بداں جور و جفا صبر و ثباتم دادند

ہمت حافظ و انفاس سحر خیزاں بود
کہ ز بند غم ایام نجاتم دادند

اس غزل کا یہ شعر:

ایں ہمہ شہد و شکر کز سخنم میریزد
اجر صبریست کزاں شاخ نباتم دادند

اس واقعے کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے اور اس کے یہ معنی بیان کیے جاتے ہیں کہ

''یہ تمام شہد و شکر جو میرے کلام سے ٹپکتا ہے اس صبر کا بدلہ ہے
جو شاخ نبات کی طرف سے مجھ کو عطا ہوا''۔

گذشتہ زمانے کی تواریخ میں اس قسم کے واقعات گو خرافات ہی سہی لیکن ان سے اس شخص کی عظمت ضرور ثابت ہوتی ہے جس کے متعلق یہ بیان کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس حکایت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ کی شاعری کو عام طور پر لوگ انسانی فطرت سے بالاتر سمجھتے تھے اس لیے یہ حکایت وضع کی گئی جس میں یہ دکھایا گیا کہ ان کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ خداداد تھی۔

اصلیت یہ ہے کہ یہ بے نظیر صوفیانہ غزل جیسا کہ خود اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، خواجہ نے اس موقع پر لکھی ہے جب کہ ان کو شرح صدر حاصل ہوا ہے اور ان کا سینہ عرفان کے اسرار سے لبریز کر دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا شعر جو اس حکایت کے ثبوت میں نقل کیا گیا ہے اس کے وہ معنی نہیں جو لوگوں نے سمجھے ہیں۔ شعر کے صحیح معنی یہ ہیں:

''یہ تمام شہد و شکر جو میرے کلام سے ٹپکتا ہے اسی صبر کا بدلہ ہے

کہ اس کے عوض میں یہ نَے شکر (کلک کلم) مجھ کو خدا نے عطا کیا‘‘

شاخ نبات کے معنی نَے شکر کے ہیں جس سے کلک قلم مراد ہے۔

خواجہ نے اپنے دیوان میں جا بجا شاخ نبات اپنے قلم ہی کو لکھا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

کلک حافظؔ سر گش سیوہ نباتست بچیں
کش سیوہ دل پذیر تر از شہد و شکر است

’’حافظؔ تیرا قلم نہایت ہی عمدہ نَے شکر ہے کہ جس کا میوہ شہد و شکر سے بھی زیادہ دل پسند ہے‘‘۔

اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قصے کا گھڑنے والا اس شعر میں شاخ نبات کے معنی سمجھ نہ سکا۔ اس نے فوراً اس کو ایک بازاری معشوقہ کا نام قرار دے کر یہ حکایت چست کر دی۔ عوام کی عجائب پرستی نے اس کو اتنا فروغ دیا کہ لغت کی کتابوں میں بھی اب شاخ نبات کے معنی ’’ایک شیرازی معشوقہ‘‘ کے لکھے جانے لگے۔

حالاں کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میرا قلم ایک نَے شکر کے ہے جس سے شہد و شکر یعنی عشق حقیقی کے رموز اور معرفت کے اسرار بھرے ہوئے شیریں اشعار اس طرح ٹپکتے ہیں جس طرح شاخ سے میٹھے پھل ٹپکتے ہوں اور یہ عشق الٰہی میں صبر کرنے کا اجر ہے جو خدا نے مجھ کو عطا فرمایا ہے۔

خواجہ گو بہت بڑے عالم، فقیہ، صالح اور زاہد تھے اور ان کا تمام وقت علمی مشغلوں اور عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا مگر باوجود اس کے ان کی طبیعت میں فطرت نے بےنظیر شاعرانہ طاقت ودیعت رکھی تھی۔ اس لیے وہ نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس زمانے میں شاعرانہ مذاق فارس کی آب و ہوا میں رچا ہوا تھا۔ خاص کر شیراز میں جہاں کہ تھوڑی مدت پہلے شیخ سعدیؒ نے اپنی بے مثل

غزلوں سے جو عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو پہلو لیے ہوئے تھیں، شاعری کا ایک نیا باب کھول کر طبیعتوں کو اور اکسا دیا تھا اور عام ولولہ اور جوش لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔ بہت سے لوگ جو اپنی ثقافت اور متانت کی وجہ سے اب تک شاعری سے پرہیز کرتے تھے۔ان کے سر بھی شیخ کی غزلوں کے سامنے جھک گئے۔ بڑے بڑے زاہد اور عابد اور اہل دل بھی اس میں عشق حقیقی کا چٹخارا دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑے اور شاعری بلاتکلف ان محفلوں میں بھی بار پا گئی جہاں اب تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ علماء اور صلحاء بھی بطور تفنن کے شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے۔اس لیے باایں علم و زہد اور صلاح و تقوا خواجہ کا شاعری کی طرف توجہ کرنا جو ان کے مرتبے کے لحاظ سے بہت ادنا اور پست تھی، عام لحاظ سے کوئی ننگ و عار کی بات نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی وہی شیخ کی روش اختیار کی اور عشق مجازی کے جام سفالیں میں عشق حقیقی کی شراب پلانی شروع کی جو ان سے پہلے شیخ پلا گیا تھا۔مگر یہ اس قدر تند اور تیز تھی کہ ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ اس سے بے خود ہوئے کہ ان کو پھر کسی کی خبر نہ ہوئی۔ مقدس محفلوں، خانقاہوں، امراء اور وزراء کی مجلسوں، بازاروں اور شاہراہوں میں، غرض ہر جگہ اسی مئے دو آتشہ کا زور چلنے لگا اور چاروں طرف حافظ شیرازی ہی کی غزل کا نغمہ گونج اٹھا:

فگند زمزمہ عشق در حجاز و عراق
نوائے بانگ غزلہائے حافظؔ شیراز

خواجہ کی شاعری تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے، وہ ان شعراء کی طرح نہیں تھے جن کا پیشہ شاعری ہو، نہ وہ مصنوعی جذبہ پیدا کرتے تھے بلکہ ان کی شاعری تفنن طبع کے طور پر تھی اور وہ درویشانہ اور عالمانہ زندگی رکھتے تھے۔ جب کوئی موقع ایسا آ جاتا تھا کہ ان کی شاعری کے جذبے کو تحریک ہو تو وہ بے ساختہ غزل کہہ دیتے تھے۔ ان کی ایک ایک غزل ایک ایک تاریخی واقعہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔کسی وہ کسی

دوست کی وفات پر روتے ہیں، کسی میں کسی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔شاہی دربار کا ذکر ہے تو غزل میں، خانقاہ کے حلقے کا ذکر ہے تو غزل میں،غزل ہی میں مدح کرتے ہیں اورغزل ہی میں مرثیے لکھتے ہیں۔

الغرض سوائے غزل کے جو طبیعت کے اصلی اپج سے ہوتی ہے قصیدہ وغیرہ جن میں مصنوعی خیالات ہوتے ہیں، انھوں نے کبھی نہیں کہا۔دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے: ''اورا باصناف سخنوری التفاتے نیست الابغزلیات۔''یعنی حافظ سوائے غزل کے اور اصناف شاعری کی طرف توجہ نہیں رکھتے تھے۔لطف علی خاں آتش کدہ میں لکھتا ہے: ''ازفنون شعر میلی کلی بغزل سرائی داشت''۔یعنی ان کی ساری توجہ غزل گوئی ہی کی طرف تھی۔ جہاں کوئی لطیف شاعرانہ بات نظر پڑ گئی، اس پر غزل لکھ دی،

ایک دفعہ حاجی قوام الدین کے یہاں دعوت تھی، گرمی کا موسم تھا، پائیں باغ میں تخت بچھا ہوا تھا، اس پر کھانا کھا رہے تھے۔پانی کے کٹورے میں نیلے آسمان اور تیسری یا چوتھی رات کے چاند کا عکس نظر پڑا، اس وقت یہ منظر بہت دل فریب معلوم ہوا اور فوراً یہ شعر موزوں کیا:

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال

ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

اس مناسب موقع شعر کو سن کر لوگ پھڑک اٹھے، اسی پر غزل پوری کی۔ شاعرانہ تخیل کی رفتار دیکھیے کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں:

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

بڑی بڑی لاجواب غزلیں بے تکلف تھوڑی دیر میں کہہ دیتے تھے۔سلطان غیاث الدین والی بنگالہ نے جس کا قصہ آگے آئے گا، جب ان کی طلبی کے لیے اپنے

خاص غلام یاقوت کو شیراز بھیجا تو رات کو جس وقت سلطان کا خط ملا اسی وقت انھوں نے سلطان کے لیے ایک بے مثل غزل لکھ کر دے دی، چناں چہ اسی کا یہ شعر ہے:

طے مکان ببین و زمان در سلوک شعر
کیں طفل یک شبہ رہ یکسالہ میرود

شعر کی رفتار کا زمانہ اور اتنی بڑی مسافت کا طے کرنا دیکھو کہ یہ ایک رات کا بچہ ایک سال کے راستے کی مسافت پر جا رہا ہے۔

امراء اور سلاطین کا دربار

خواجہ کی تمام زندگی کا زمانہ فارس اور خاص کر شیراز کے لیے ایک نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ اس عہد میں بڑے بڑے عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے۔ خواجہ کی ۷۵۔۷۶ سال کی زندگی میں شیراز میں سات بادشاہ ہوئے اور اکثر ان میں باہم سخت خوں ریز لڑائیاں ہوئیں۔ سلطان مظفر کے بیٹے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ خانہ جنگی میں مصروف رہے اور اسی میں انھوں نے سلطنت کھو دی۔ سب سے آخری میں تیموری حملہ شیراز پر ہوا جو ایک قیامت کا نمونہ تھا۔

ان بے دردیوں اور ہول ناک خوں ریزیوں کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انقلابات زمانہ کے بڑے بڑے منظر ان کی نگاہ سے گزرے۔ انھوں نے دیکھا کہ آج دنیا جس سر پر تاج رکھتی ہے کل اسی خاک و خون میں پامال کر ڈالتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے چند روزہ جاہ و جلال سے سخت نفرت ہو گئی اور انھوں نے کنج خلوت میں اطمینان کے ساتھ ایک گھڑی گزار دینے کو تمام دنیا کی بادشاہی پر، جس میں ہزاروں جھگڑے ہوتے ہیں، ترجیح دی اور پکار اٹھے:

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ عمرو ہائے ہوئے

اطمینان کے ساتھ کسی حسین کو ایک وقت ایک نظر دیکھنا اس سے بہتر ہے کہ تمام

عمر سر پر چتر شاہی ہو اور سیکڑوں بکھیڑے ہوں۔

خواجہ نے ہر چند ان ناگوار حادثات کا ذکر جن سے یقیناً وہ متاثر ہوئے ہوں گے، اپنے کلام میں نہیں آنے دیا اور اپنی اصلی شاعرانہ خوشی کے آب حیات میں اس زہر کے چھینٹے نہیں پڑنے دیئے لیکن آخر انسان تھے، کہاں تک ضبط کرتے۔ ایک غزل میں رو ہی پڑے۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شرر می بینم
ہر کسے روز بہی می طلبد زیں ایام
مشکل آنست کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہانرا ہمہ شربت ز گلاب و قند است
قوت دانا ہمہ از خون جگر میں بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم
دخترانرا ہمہ جنگست و جدل با مادر
پسرانرا ہمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دار و
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
پند حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن
کہ من ایں پند بہ از دُر گہر می بینم(۱)

خواجہ ایک نہایت ملنسار اور خوش خلق انسان تھے۔ امیر و غریب، ادنا و اعلا سب سے ملتے تھے۔ اور ہر طبقے میں وہ ہر دل عزیز تھے۔ فقیروں کے حلقے کے چراغ تھے اور بادشاہوں کی بزم کی شمع۔ وہ تمام شاہان شیراز کے دربار میں آمد و رفت رکھتے

تھے۔مگر درباروں میں ان کا اعزاز ایک مقدس بزرگ اور ممتاز عالم کی حیثیت سے تھا، نہ کہ شاعر کی حیثیت سے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی امیر یا وزیر کی شان میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا جو شعرا کا خاصہ خیال کیا جاتا ہے اور جس سے شیخ سعدی جیسے بزرگ تارک الدنیا بھی نہیں بچ سکے۔انھوں نے بہت کیا تو یہ کیا کہ کسی غزل میں ایک دو شعر کسی تعریف میں بڑھا دیئے اور اس کا نام لے دیا اور بس۔

ان کے ابتدائی زمانے میں سلطان ابو سعید خاں بغداد کا بادشاہ تھا۔تمام عراق و فارس اس کے قبضے میں تھا۔اس کے زمانے میں اس کی طرف سے شیخ حسین پسر امیر الامراء چوپان شیراز کا والی تھا۔اہل شیراز عام طور پر اس سے ناراض تھے، ۷۳۶ھ میں جب سلطان ابو سعید خاں نے وفات پائی اور بوجہ اس کے کہ کوئی بیٹا نہ تھا، اطراف ممالک میں جس کا جہاں بس چلا اس نے قبضہ کر لیا اور ایک سلطنت کی گیارہ سلطنتیں ہو گئیں، تو شیخ حسین اپنی جان کے خوف سے شیراز سے بھاگ گیا۔ شیخ ابو اسحاق نے جو سابق والی شیراز محمد شاہ انجو کا بیٹا تھا، موقع پا کر شیراز اور اصفہان پر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔

ابو اسحاق:

شاہ ابو اسحاق کا عہد شیراز والوں کے لیے امن و عیش کا زمانہ تھا۔ملک میں خوشحالی اور رفاہیت تھی۔خواجہ اس کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے اور وہ ان کا بہت قدر دان تھا۔

شاہ ابو اسحاق میں اگرچہ تمام خوبیاں تھیں مگر وہ آرام پسند تھا۔۷۵۴ھ میں امیر مبارز الدین (۲) مظفر نے اس کو غافل پا کر شیراز پر حملہ کر دیا۔

☆☆☆☆

۱: یہ بات دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں کہ حافظ کی یہ مشہور غزل نائینی و نذیر احمد اور قزوینی دونوں نسخوں میں نہیں ہے۔

۲: امیر مظفر کا باپ محمد شاہ خراسان کا ایک معمولی باشندہ تھا۔سلطان محمد خدا بندہ

کے زمانے میں اس کو کچھ عروج ہوگیا اور وہ شہر مراغہ میں ایک معزز عہدے پر مقرر کیا گیا، وہاں اپنی عقل مندی شجاعت سے اس نے کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ جن کے صلے میں اس کو امارت کا درجہ عطا ہوا۔ سلطان ابوسعید خان کے عہد میں اس کا انتقال ہوگیا۔ سلطان نے اس کے مظفر کو امارت عطا فرمائی۔ جب سلطان کے مرنے کے بعد طوائف الملو کی پھیلی تو امیر مظفر نے یزد پر اپنی سلطنت قائم کرلی، شاہ ابواسحاق نے اس کو کمزور پا کر یزد بھی اس سے چھین لیا مگر اس نے ایسی جمعیت فراہم کی کہ ابواسحاق کو شکست دی اور شیراز سے تبریز تک اپنی حکومت قائم کرلی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ امیر مظفر جب فوج لے کر شیراز کے ارادے سے چلا تو ابواسحاق کے وزیروں نے اس سے کہنا شروع کیا کہ اب ہم کو بھی لڑائی کی تیاری کرنی چاہیے، وہ اس بات سے کبیدہ خاطر ہوتا تھا اور اس نے منع کر دیا تھا کہ اب جو میرے سامنے اس قسم کی بات کہے گا میں اس کو سزا دوں گا۔ یہاں تک کہ امیر مظفر کی فوجیں شیراز کے گرد آ گئیں، لیکن کسی کی مجال تھی کہ بادشاہ کو خبر کرے۔ آخر امین الدین جھرمی نے جو بادشاہ کا خاص ہم نشین تھا، کہا کہ آج کل بہار کا موسم، چاروں طرف میدان اور پہاڑ سرخ و سبز ہو رہے ہیں، حضور بالا خانے پر تشریف لے چلیں اور ملاحظہ فرمائیں۔ جب شاہ بالا خانے پر آیا تو شہر کے چاروں طرف لشکر کو دیکھا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ ایک وزیر نے کہا مظفر شیراز کو فتح کرنے کے لیے آیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ عجب احمق ہے جو بہار کے موسم کو اس طرح رائیگاں کھو رہا ہے اور یہ شعر پڑھ کر نیچے اتر آیا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم
چو فردا رسد کار فردا کنیم

آؤ آج کی رات تو مزے میں گزاریں، کل کا کام کل دیکھا جائے گا!

دولت شاہ کہیں کہیں اس قسم کے قصے بھی لکھ دیتا ہے جو سادہ لوحوں کو دلچسپ معلوم ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ ابو اسحاق اور مظفر میں ابتدا ہی سے لڑائیاں ہوتی چلی آتی تھیں۔اور ہمیشہ ابو اسحاق کو فتح ہوتی تھی کیوں کہ اس کے پاس فوج بہت زیادہ تھی لیکن اس حملے میں بازی پلٹ گئی، شاہ ابو اسحاق گو بڑی جرأت سے لڑا لیکن امیر مظفر نے اس کو شکست دے دی اور وہ میدان چھوڑ کر اصفہان بھاگا۔وہاں ۴۔۵ سال رہا اور پھر امیر مظفر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔خواجہ اپنے اس قدر دان کے مرنے پر اس غزل میں روتے ہیں:

یاد باد آں کہ سر کوے توام منزل بود
دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
راست چون سوسن و گل ز اثر صحبت پاک
بر زبان بود مرا انچہ ترا در دل بود
در دلم بود کہ بے دوست نباشم ہرگز
چہ تواں کرد کہ سعی من و دل باطل بود
راستی خاتم فیروزہ بو اسحاقی
خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود
دیدی آں قہقہہ کبک خراماں حافظؔ
کہ ز سر پنجہ شاہین قضا غافل بود

حاجی قوام:

حاجی قوام الدین حسن طغچی خواجہ کے سب سے پہلے مربی اور خاص سرپرست تھے۔انھوں نے ان کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔خواجہ نے بہت سی غزلوں میں حاجی صاحب موصوف کا نام لیا ہے۔حتیٰ کہ جس غزل میں انھوں نے اپنی خیالی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔اس میں بھی حاجی قوام کو نہیں بھولے ہیں۔کہتے ہیں:

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام

مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام
ساقی شکر دہان و مطرب شیریں سخن
ہم نشین نیک کردار و ندیم نیک نام
شاہدے از لطف و پاکی رشک آب زندگی
دلبرے در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
غمزۂ ساقی بیغمائے خرد آہختہ تیغ
زلف جاناں از برائے صید دل گسترده ام
بادۂ گلرنگ و تلخ و تیز و خوش گوار و سبک
نقلے از لعل و نگار و نقلے از یاقوت خام
بزم گاہے دلنشاں چوں قصر فردوس بریں
گلشنے پیرامنش چوں روضۂ دارالسلام
صف نشیناں نیک خواہ و پیشکاراں با ادب
دوستداراں صاحب اسرار و حریفاں دوستکام
نکتہ دانے بذلہ گو چوں حافظؔ شیریں سخن
بخشش سوزے جہاں افروز چوں حاجی قوام
ہر کہ ایں صحبت نخواہد خوشدلی بروے تباہ
و آنکہ عشرت نخواہد زندگی بروے حرام

بعض لوگوں نے جن میں کپتان کلارک بھی ہیں غلط فہمی سے حاجی قوام اور خواجہ قیام الدین عیار کو کہ وہ بھی حافظ کے مربیوں میں سے تھے، ایک ہی شخص خیال کر لیا ہے۔ حالاں کہ دونوں دو شخص تھے۔ حاجی قوام شاہ ابو اسحاق کے وزیر خزانہ تھے۔ انھوں نے ۷۵۴ھ میں وفات پائی اور خواجہ قوام شاہ شجاع کے وزیر تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

امیر مظفر:

امیر مبارز لادین محمد مظفر ایک سپاہی منش اور سخت طبیعت کا آدمی تھا۔ جب شیراز پر اس کا قبضہ ہوا تو اس نے بہت سختیاں کیں یہاں تک کہ تمام لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ اس کے بیٹے شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ عنقریب ملک میں بغاوت ہونی چاہتی ہے تو امرائے لشکر کے ساتھ متفق ہو کر ۷۶۰ھ میں مظفر کو گرفتار کر لیا۔ آنکھوں میں سلائی پھیر کر قید کر دیا اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ نے یہ قطعہ اسی واقعے کے متعلق لکھا ہے:

شاہ غازی خرد و گیتی ستاں
آں کہ از شمشیر او خوں می چکید
گہ بیک حملہ سپاہے مے شکست
گہ بہوئے قلب شیراں میدرید
عاقبت شیراز و تبریز و عراق
چوں مسخر کرد وقتش در رسید
آنکہ روشن بُد جہاں بینش بدد
میل در چشم جہاں بینش کشید

شاہ شجاع:

ابو الفوارس شاہ شجاع کے تخت نشین ہونے سے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ وہ خود عالم، علم دوست اور بڑا دین دار تھا۔ علماء و صلحاء کی اس کے دربار میں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ خواجہ نے بیسیوں غزلوں میں اس کا نام لیا ہے۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں:

جبین و چہرۂ حافظ خدا جدا نکناد
ز خاک بارگہ کبریائے شاہ شجاع

حافظ کی پیشانی اور چہرے کو شاہ شجاع کی بارگاہ سے خدا جدا نہ کرے۔

شاہ شجاع خواجہ فقیہ (۱) عماد کرمانی کے ساتھ بہت عقیدت رکھتا تھا اور اس قدر ان کو مانتا تھا کہ خود ان کی خانقاہ میں جایا کرتا تھا۔

فقیہ موصوف کے پاس ایک بلی تھی جس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ فقیہ نماز پڑھتے ہیں تو وہ بھی ساتھ ساتھ پڑھتی ہے۔شاہ شجاع اس کو ان کی کرامت سمجھتا تھا۔خواجہ حافظ کو ایسی باتوں پر بھلا کب یقین آتا تھا۔انھوں نے نہایت لطیف پیرائے سے ایک غزل میں فقیہ موصوف پر چوٹ کی:

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد
بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد
ساقی بیا کہ شاہد رعنائے صوفیاں
دیگر بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد
اے دل بیا کہ ما بہ پناہ خدا رویم
زانچہ آستین کہ تہ درست دراز کرد
اے کبک خوش خرام کجا می روی بست
غرہ مشو کہ "گربۂ زاہد" نماز کرد
حافظ مکن ملامت رنداں کہ در ازل
ما را خدا ز زہد ریا بے نیاز کرد

عبید زاکانی (۲) کی مثنوی موش و گربہ ہے۔جس میں اس نے ایک بلی کا قصہ لکھا ہے۔

☆☆☆☆☆

۱: زہد و اتقا میں مشہور زمانہ تھے۔ تمام لوگ اور خاص کر مظفری خاندان کے شاہزادے ان کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، باوجود علم و فضل اور زہد و تقوا کے نامور شاعر بھی تھے۔ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

دل عکس رخ خوب تو در آب رواں دید
و والہ شد و فریاد بر آورد کہ ماہی

۷۷۳ھ میں وفات پائی۔ کرمان میں مدفون ہوئے۔ قبر زیارت گاہ ہے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ کلام نہایت سادہ اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔

۲: فارس کا مشہور ہجو گو ہے۔ شاہ ابو اسحاق کے زمانے میں تھا۔ پہلے اس کا اہل علم میں شمار ہوتا تھا۔ دولت شاہ کا بیان ہے ایک بار کوئی کتاب علم معانی میں تصنیف کی۔ شاہ ابو اسحاق کی خدمت میں اس کو پیش کرنے کے لیے لے گیا۔ خدام نے روکا اور یہ کہا کہ ابھی حضور ایک بھانڈ کی نقلوں میں دل بہلا رہے ہیں۔ عبید نے سوچا کہ جب بھانڈوں کی ایسی قدر ہے کہ اہل علم پر ان کو ترجیح دی جاتی ہے تو پھر لکھنا پڑھنا فضول ہے۔ اسی دن سے مولویت کا جبہ اتارا اور ہزالی شروع کی۔ وہ ایسی فحش کہ اللہ کی پناہ ۷۷۱ھ میں مرگیا۔

☆☆☆☆☆

جو سیکڑوں چوہے کھا کر تائب ہوگئی اور عبادت میں مصروف ہوئی۔ چوہا اس کی خوش خبری اپنے بادشاہ کو دیتا ہے:

مژدہ گانا کہ گربہ عابد شد
مومن و زاہد و مسلمانا

خوش خبری ہو کہ بلی عبادت گزار مومن، زاہد اور مسلمان ہوگئی۔

اس قصہ سے "گربۂ عابد" مثل مشہور ہوگئی تھی۔

خواجہ حافظ نے اس شعر میں اس مثل کی طرف اشارہ کیا ہے:

اے کبک خوش خرام کجا میروی بایست
غرہ مشو کہ گربۂ زاہد نماز کرد

اے ناز سے چلنے والی چکور کدھر جاتی ہے، ٹھہر جا، دھوکے میں نہ رہنا کہ عبادت گزار بلی نمازی ہوگئی۔

فقیہ بھی تاک میں رہے۔ اتفاق سے خواجہ نے ایک غزل لکھی جس کا مقطع یہ تھا:

گر مسلمانی ازینست کہ حافظؔ دارد
آہ اگر از پے امروز بود فردائے

فقیہ عماد نے شاہ شجاع سے کہا اس شعر سے انکار قیامت لازم آتا ہے۔ شاہ شجاع چوں کہ فقیہ کا بڑا مرید تھا۔ اس نے حکم دیا کہ خواجہ حافظ بلائے جائیں اور ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے ایسا شعر کیوں کہ جس سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے۔ خواجہ کو بھی یہ خبر لگ گئی۔ انھوں نے اس شاعرانہ مضمون کو سمجھانے کے بجائے یہ تدبیر کی کہ اس سے پہلے ایک شعر اور بڑھا کر اس کو ایک عیسائی کا مقولہ کر دیا:

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میں گفت
بر در میکدہ با دف و نے ترسائے

یہ بات مجھے بہت پسند آئی جو کہ صبح کو ایک شراب خانے کے دروازے پر بانسری اور دف بجا کر ایک عیسائی کہہ رہا تھا۔

اب یہ ایک عیسائی کا قول ہو گیا اور کفر کی نقل کفر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے شاہ شجاع خاموش ہو گیا اور خواجہ نے خوش اسلوبی کے ساتھ فقیہ کا داؤ کاٹ دیا۔

خواجہ قوام:

شاہ شجاع کا وزیر قوم الدین عیار بھی خواجہ کے قدر دانوں میں سے تھا ان کا وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا ایک دن جب وظیفہ دیر سے پہنچا تو خواجہ نے ایک غزل لکھ کر وزیر موصوف کے پاس بھیجی جس میں اس کی طرف توجہ دلائی اس کا مطلع یہ ہے

رسیدہ مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید
وظیفہ گر برسد مصرفش گل است و نبید

بہار کے آنے اور سبزہ کے اگنے کی خوش خبری آ گئی، ایسی حالت میں اگر وظیفہ آئے تو گلاب و شراب میں صرف کیا جائے

۷۶۴ھ میں شاہ شجاع نے کسی سیاسی غلطی کی وجہ سے ان کو قتل کر ڈالا۔

توران شاہ:

خواجہ قوام مقتول کے بعد خواجہ کمال الدین اوران کے بعد جلال الدین توران شاہ، شاہ شجاع کا وزیر ہوا، یہ خواجہ کے کمالات کا فدائی تھا اوران کے ساتھ بڑا فیاضانہ سلوک کرتا تھا۔خواجہ نے بہت سی غزلوں میں نہایت شکریئے کے ساتھ وزیر موصوف کا نام لیا ہے۔اپنی اس لاجواب غزل میں اس کی اخلاقی جرأت کی تعریف کی ہے:

گرم از دست برخیزد کہ با دلدار بنشینم
ز جام وصل مے نوشم ز باغ عیش گل چینم
صباح الخیر زو بلبل کجائی ساقیا برخیز
کہ غوغا میکند در سر نوائے چنگ دوشینم
شب رحلت ہم از بستر روم تا قصر حور العین
اگر در وقت جان دادن تو باشی شمع بالینم
مگر دیوانہ خواہم شد دریں سواد کہ شب تار روز
سخن با ماہ میگویم پری در خواب می بینم
لبت شکر بمستاں داد و چشمت مے بہ میخوراں
منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم
وفاداری و حق گوئی نہ کار ہر کسے باشد
غلام آصف تا جلال الدینم والدینم

زین العابدین:

۸۶ ۷ھ میں شاہ شجاع کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا زین العابدین تخت نشین ہوا جو اگرچہ حسن میں اپنے زمانے کا یوسف تھا۔لیکن کم عقل تھا۔اس مغرور شاہزادے نے باپ کے مصاحبوں اور ملازموں کے ساتھ بدسلوکیاں شروع کیں

اور شیراز میں دور مظفری تازہ ہو گیا۔

خواجہ کی غزلیں اور خاص کر نئی غزلیں جو وہ لکھتے تھے، بادشاہوں اور شاہزادوں کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ انھوں نے اس زمانے میں جس قدر غزلیں لکھی ہیں ان میں اس کو خصوصیت کے ساتھ رحم اور دادگری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ منجملہ ان کے ایک غزل یہ ہے:

به ملازمان سلطان که رساند این دعا را
که بشکر بادشاهی ز نظر مران گدا را

چه قیامت است جانان که بعاشقا نمودی
دل و جان فدائے رویت بنما عذار مارا

ز رقیب دیو سیرت بخدائے خود پناهم
مگر آن شهاب ثاقب مددے کند خدا را

دل عالمے بسوزی چو عذار بر فروزی
تو ازیں چه سود داری که نمی کنی مدارا

مژه سیاهت ار کرد بخون ما اشارت
ز فریب او بیندیش و غلط مکن نگارا

همه شب دریں اسیدم که نسیم صبح گاهی
به پیام آشنایان بنوازد آشنا را

بخدا که جرعه ده تو بحافظؔ سحر خیز
که دعائے صبحگاهی اثری کند شمارا

مثل مشہور ہے کہ ظلم کی عمر تھوڑی ہوتی ہے۔ ابھی ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ۷۸۹ھ میں شہنشاہ تیمور ایک گرجتے برستے بادل کی آ پہنچا۔ زین العابدین نے مقابلے کے لیے لشکر فراہم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر خوف کے

مارے صاحب قرآں کے آنے سے پہلے ہی شیراز سے بھاگا اور اپنے چچا منصور کے پاس تستر میں پہنچا۔

تیمور نے شیراز کو خالی پا کر اس پر قبضہ کر کے شاہ شجاع کے بھائی نصرت الدین یحیٰ کو جو نیر دپر حکمران تھا اور جس نے اس کی اطاعت تسلیم کر لی تھی، شیراز کو بھی سپرد کر دیا۔

تیمور نے شیراز میں خواجہ کو بھی یاد کیا جن کی شہرت وہ عرصے سے سن رہا تھا۔ خواجہ تشریف لے گئے۔ وہ بہت اعزاز سے پیش آیا اور پوچھا کہ یہ شعر آپ کا ہے:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ میں نے جو بڑی بڑی فوجوں سے لڑ کر دنیا فتح کی اور بھاری بھاری سلطنتوں پر قبضہ کر لیا تو اس لیے کہ سمرقند اور بخارا کو جو میرے وطن ہیں آباد کروں اور آپ نے ان کی یہ قدر کی کہ معشوق کے خال ہندو پر تصدق کر ڈالا۔ خواجہ نے جواب دیا کہ جہاں پناہ! یہ اسی غلط بخشی کا نتیجہ ہے کہ آج میں اس حال میں ہوں۔ تیمور اس لطیفے سے بہت خوش ہوا اور خواجہ کو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا۔

انسائی کلوپیڈیا برٹانیکا کا مصنف اس واقعے سے انکار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ تیمور شیراز میں خواجہ کے انتقال کے کئی سال بعد گیا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہیں کہ تیمور دو مرتبہ شیراز میں آیا ہے۔ پہلی مرتبہ ۷۸۷ھ میں جب کہ خواجہ زندہ تھے اور دوبارہ ۷۹۵ھ میں جب کہ وہ وفات پا چکے تھے۔

شاہ یحیٰ:

شیراز کے تمام لوگ تیمور کے آنے سے ڈر گئے تھے مگر جب اس نے وہاں کی حکومت شاہ یحیٰ کے سپرد کر دی تو ان کو بڑی خوشی ہوئی کیوں کہ یحیٰ بہت لائق اور

منصف مزاج بادشاہ تھا۔خواجہ ایک غزل میں کہتے ہیں:

گر نکردی نصرت دین شاہ یحییٰ از کرم

کار ملک و دین ز نظم و انتساق افتادہ بود

اگر شاہ یحییٰ اپنے کرم سے دین کی نصرت نہ کرتے تو ملک اور دین کا نظم ونسق خراب ہو چکا تھا۔

شاہ منصور:

زین العابدین جب تستر سے بھاگ کر گیا تو اس کے چچا منصور نے اس کی بزدلی پر اس کو قید کر دیا اور خود ایک بہت بڑی جمعیت فراہم کر کے شیراز کی طرف آیا۔شاہ یحییٰ کو مقابلے میں ناکامیابی ہوئی اور آخر وہ میدان میں مارا گیا، منصور بڑے کروفر سے شیراز میں داخل ہوا۔

اہل شیراز نے منصور کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا کیوں کہ تمام آل مظفر میں اس سے زیادہ لائق، بہادر اور عادل کوئی شہزادہ نہ تھا۔خواجہ نے بھی ایک غزل اس کے خیر مقدم میں لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید

نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید

آجاؤ کہ شاہ منصور کا جھنڈا آ گیا اور فتح کی نوید اور خوش خبری چاند اور سورج تک پہنچ گئی۔

شاہ منصور خواجہ کا بہت احترام کرتا تھا اور ان کے کمالات کا بڑا قدرداں تھا۔ خواجہ نے جابجا غزلوں میں اس کی تعریف کی ہے۔

واپسی میں تیمور نے منصور کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی خاندان مظفر کا چراغ گل ہو گیا، مگر خواجہ اس سے کئی سال پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔

ان کے علاوہ بڑے بڑے امراء و روسا مثلاً فخر الدین، عبدالصمد، امین الدین حسن وغیرہ خواجہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ وہ اپنے تقدس، زہد، علم اور خدا داد شاعرانہ کمال کی وجہ سے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں عام مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اپنی زندگی میں انتہائی ہردلعزیزی جو کسی باکمال کو حاصل ہو سکتی ہے، ان کو حاصل تھی۔

خواجہ کی شہرت

گذشتہ زمانے میں اکثر اہل کمال کی شہرت ان کے مرنے کے بعد ہوتی تھی۔ لیکن خواجہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی شہرت زندگی ہی میں چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ نہ صرف ایران بلکہ بغداد، عراق، جنوبی ہند اور بنگال تک ان کی زندگی ہی میں ان کا نام مشہور ہو چکا تھا۔ قافلوں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں ملکوں ملکوں جاتی تھیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں اور نوابوں نے ان کو بلانا شروع کیا، وہ ان کے پاس تحفے تحائف اور اشتیاق نامے بھیجتے تھے، لیکن خواجہ اپنی سیر چشمی اور گوشہ نشینی کی وجہ سے کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

سلطان (۱) احمد جلائر ایلخانی کی بڑی خواہش تھی کہ خواجہ بغداد میں تشریف لائیں۔ بہت سے تحائف اور خطوط بھیجے لیکن خواجہ نہیں گئے۔ ایک غزل بطور شکریہ کے لکھ کر بھیج دی جس کا ایک شعر یہ ہے:

گرچہ دوریم، بیاد تو قدح مے نوشیم!

بُعد منزل نبود در سفر روحانی

اگرچہ ہم دور ہیں لیکن آپ کی یاد میں شراب پیتے ہیں۔ روحانی سفر میں فاصلہ کوئی چیز نہیں ہے۔

شاہ شجاع کا بھائی قطب الدین محمود جو اصفہان کا حاکم تھا۔ اس میں اور شاہ شجاع میں سخت لڑائیاں ہوئیں اور چوں کہ سلطان احمد والی بغداد کی بہن قطب

الدین محمود کے نکاح میں تھی، اس وجہ سے وہاں بھی اس کو امداد ملی۔ اس نے شیراز کا محاصرہ کرلیا۔ مجبوراً شاہ شجاع نے اس سے صلح کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد محمود مر گیا۔ شاہ شجاع نے یہ رباعی لکھی:

محمود برادرم شہ شیر مکیں
میکرد خصومت از پے تاج و نگیں
کردیم دو بخشش تا بیا ساید خلق
او زیر زمین گرفت و من روئے زمیں

اس کے مرنے کے بعد شاہ شجاع کو سلطان احمد سے انتقام لینے کا موقع ملا اور دونوں میں باہم خوب لڑائیاں رہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ خواجہ کے بغداد نہ جانے کا سبب ان بادشاہوں کی باہمی عداوت ہی ہو، ورنہ ان کو وہاں جانے کی بڑی آرزو تھی۔ فرماتے ہیں:

رہ نبردیم بمقصود خود اندر شیراز
خرم آں روز کہ حافظؔ رہ بغداد کند

شیراز میں اپنے مقصود تک ہم نہیں پہنچ سکے، وہ دن بڑا اچھا ہوگا جس دن حافظ بغداد کو روانہ ہوگا۔

سلطان قطب الدین کے وزیر عماد الدین محمود نے بھی اصفہان سے خواجہ کو طلب کیا، لیکن غالباً انھیں ملکی جھگڑوں کی وجہ سے خواجہ نے وہاں جانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دفعہ ایک غزل جو ''بہاریہ'' کے نام سے مشہور ہے لکھ کر وزیر موصوف کے پاس بھیج دی تھی۔ اس نے بڑی قدردانی کی اور صلہ بھیجا۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں:

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی

کنونکہ لالہ بر افروخت آتش نمرود

چو گل سوار شود بر ہوا سلیماں وار

سحر کہ مرغ در آید بہ نغمۂ داؤد

بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد

وزیر ملک سلیماں عماد دیں محمود

جنوبی ہند میں اس زمانے میں سلطان محمود شاہ بہمنی حکمران تھا۔ میر فضل اللہ انجو جو علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید تھے، سلطان کے وزیر تھے۔ خواجہ کا شہرہ مدت سے سنتے تھے۔ ایک دفعہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ا: ایلخانی سلطنت کا بانی امیر حسن نوئنان ہے اس کے باپ کا نام امیر فیو تائے ہے جو امیر ایلخان کا بیٹا تھا امیر ایلخان کنجا تیو خان کے زمانے میں امیر الامرائی کا منصب رکھتا تھا۔ بعد ازاں اس کا پوتا امیر حسن ابو سعید خان کے زمانے میں خراسان میں کسی ممتاز منصب پر سرفراز ہو گیا۔ سلطان ابو سعید خان کے مرنے کے بعد جب انقلاب واقع ہوا تو بغداد اور تبریز وغیرہ پر امیر حسن نے قبضہ کر کے ایلخانی حکومت قائم کر لی۔ امیر حسن کے بعد اس کا بیٹا شیخ اویس تخت نشین ہوا۔ اویس کا بیٹا احمد تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

علم دوست بادشاہ کے اشارہ سے خواجہ کے نام ایک خط لکھا جس میں ان سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ دکن میں تشریف لائیں۔ خط کے ہمراہ اشرفیاں بھی بطور زاد راہ کے بھیجی تھی۔ خواجہ نے ان اشرفیوں میں سے اپنا قرضہ ادا کیا، کچھ بھانجوں کو دیا اور باقی ماندہ سے زاد راہ تیار کر کے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ راستے میں فیاضی نے مفلس کر دیا۔ ایران کے دو سوداگروں خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گاذورنی نے جو معتبر تاجر تھے اور ہندوستان کو آرہے تھے، خواجہ کے اخراجات سفر کی کفالت اپنے ذمے لی اور بندرگاہ ''ہرمز'' پر پہنچے۔

دکن کا ایک جہاز ہرمز سے واپس آ رہا تھا اس پر سوار ہوئے۔ اتفاق یہ کہ ابھی لنگر اٹھا بھی نہیں تھا کہ طوفانی ہوا چلی، گھبرا گئے۔ آخر کشتی کنارے پر لگائی گئی۔ اتر گئے اور ہندوستان آنے کا ارادہ فسخ کر دیا۔ انھیں سوداگروں کے ہاتھ میر فضل اللہ انجو کے پاس یہ غزل لکھ کر بھیج دی۔

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بکسے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں در آں درجست
کلاہ دلکش است اما بہ ترک سر نمی ارزد
بکوئے سیفروشش بجامے بر نمیگیرند
زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد
ترا آں بہ کہ روے خود ز مشتاقاں بپوشانی
کہ شادی جہاں گیری غم لشکر نمی ارزد
رقیبم سرزنش ہا کرد کز ایں باب رخ برتاب
چہ افتاد ایں سر مارا کہ ایک افسر نمی ارزد
بس آساں مے نمود اول غم دریاے ببوسود
غلط گفتم کہ ایں طوفاں بصد گوہر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر
کہ یک جو منت دو ناں بصد من زر نمی ارزد

میر فضل اللہ نے یہ قصہ بادشاہ سے بیان کیا۔ اس کو بڑا افسوس ہوا اور کہا کہ خواجہ ہمارے ارادے سے چلے لیکن ہماری بدقسمتی نے ان کو ہم تک نہ پہنچنے دیا، اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم اپنے انعام سے ان کو محروم نہ کریں، چنانچہ ملا محمد قاسم مشہدی کے ہاتھ ایک ہزار تنکہ طلا اور ہندوستان کے بہت سے بیش قیمت تحفے خواجہ

کے پاس بھجوائے۔

سلطان غیاث الدین والی بنگالہ متوفی ۷۷۵ھ جو علم کا بڑا قدردان اور نہایت فیاض تھا، اس نے اپنے خاص خادم یاقوت کے ہاتھ کچھ زر نقد اور تحفے خواجہ کے پاس بھیجے اور خواہش کی کہ وہ بنگال تشریف لائیں۔ خواجہ سفر سے پہلے ہی توبہ کر چکے تھے، معذرت کی اور یہ غزل لکھ کر یاقوت کو دے دی۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود
دیں بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود
می دہ کہ نو عروس چمن حد حسن یافت
کار ایں زمان بہ صنعت و لالہ میرود
آں چشم جادوانۂ عابد فریب بیں
کش کاروان سحر ز دنبالہ میرود
خوے کردہ می خرامد و بر عارض سمن
از شرم روے او عرق ژالہ میرود
باد بہار می وزد از گلستان شاہ
وز ژالہ بادہ در قدح لالہ میرود
طے مکان بہ بین و زمان در سلوک شعر
کیں طفل یکشبہ رہ یک سالہ میرود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں
خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

فرشتہ اس کے متعلق ایک دلچسپ قصہ لکھتا ہے۔ کہ سلطان غیاث الدین ایک

مرتبہ سخت بیمار ہوا۔اس کے یہاں تین لونڈیاں تھیں جن کے نام سرو، گل اور لالہ تھے انھوں نے سلطان کی بیماری کے زمانے میں بہت خدمت کی اور جب صحت ہو گی تو روزانہ نہلاتی تھیں۔ سلطان ان سے بہت خوش تھا اور زیادہ محبت کرتا تھا یہاں تک کہ بیگمات کو ان پر رشک آنے لگا۔انھوں نے چلتر سے ان کو غسالہ کہنا شروع کیا۔ غیاث الدین نے جب سنا تو ہنسا اور بے ساختہ اس کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود

دوسرا مصرع نہیں لگتا تھا۔دربار کے شاعروں کو بلوایا۔وہ بھی کوئی اچھا مصرع نہیں لگا سکے۔خواجہ حافظ کی شہرت تو سنی ہی تھی ان کے پاس شیراز میں یہ مصرع بھیج دیا، چنانچہ اسی مصرع پر غزل انھوں نے پوری کی۔

خواجہ نے اس مصرع پر جو مصرع لگایا ہے یعنی "ویں بحث با ثلاثہ غسالہ میرود" اس میں لطف یہ ہے کہ ثلاثۂ غسالہ کے معنی تو ہیں تین نہلانے والیاں لیکن بادہ خواروں کی اصطلاح میں شراب کے ان تین پیالوں کو کہتے ہیں جو صبح کو پیے جاتے ہیں اور جن سے شب کا خمار اور تمام رنج و غم دھل جاتا ہے۔

خواجہ کا تقدس

خواجہ حافظ، عالم، فقیہ اور مفسر تھے اور گو مولانا جامی کو ان کے مرشد کا پتا نہیں لگ سکا لیکن منتخب التواریخ میں ہے کہ وہ خواجہ بہاء الدین نقش بند کے مرید تھے۔

جب خواجہ بہاءالدین نقش بندؒ بخارا سے حج کو جا رہے تھے تو شیراز میں بھی کچھ دنوں کے لیے قیام فرمایا۔کہا جاتا ہے کہ حافظ نے حضرت موصوف ہی کی آمد میں یہ غزل لکھی تھی:

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید

کہ ز انفاس خوشش بوئے کسے می آید

ان کی صحبت کے فیض سے شرح صدر بھی حاصل ہو گیا اور دل پر عرفان کا

دروازہ کھل گیا۔ ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، جس کا ایک شعر یہ ہے:

بار غمے کہ خاطر ما خستہ کردہ بود
عیسیٰ دمے خدا بفرستاد و بر گرفت

حج کرنے کے بعد واپسی میں بھی وہ یہاں تشریف لائے۔ خواجہ نے کئی غزلوں میں ان کی جدائی اور رنج انتظار کی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ خیر مقدم کے طور پر ایک غزل ان کی خدمت میں لکھ کر بھیجی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

بعض لوگ لکھتے ہیں کہ خواجہ مجذوب سالک یعنی دیوانے صوفی تھے۔ ایک شخص لکھتا ہے کہ وہ ملامتیہ فرقے سے تھے یعنی اپنی ظاہری حالت گنہگاروں کی سی رکھتے تھے تاکہ جو شخص دیکھے ملامت کرے اور دل میں کسی قسم کا تکبر نہ آنے پائے مگر یہ ایسی غلط باتیں ہیں کہ ان کی تردید کی ضرورت نہیں۔ خواجہ آخر عمر تک مدرسے میں تعلیم دیتے رہے۔ بادشاہوں کے دربا ﷺں میں ان کا آنا جانا ہوتا تھا۔ کہیں کہیں اپنی غزلوں میں نصیحت بھی کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر لوگوں کی نگاہ میں معزز اور محترم سمجھے جاتے تھے، نہ کہ دیوانہ یا قابل ملامت۔ تمام تذکرہ نویس ان کو ایک باوقار عالم اور صوفی لکھتے ہیں۔

بعض یورپین مصنفوں نے جن کو فارسی شاعری کی اصلیت کا بہت کم اندازہ ہے مثلاً بکنل اور انسائی کلوپیڈیا یا برٹانیکا کا مصنف، ان لوگوں نے خواجہ کے اشعار کو دیکھ کر اور کو واقعی سمجھ کر خواجہ کو شراب خوار اور رند لکھا ہے۔

لیکن اگر ان لوگوں نے ذرا بھی ان کے حالات لکھنے میں تحقیق کی ہوتی اور اولیاء اللہ کے تذکرے اٹھا کر دیکھتے تو معلوم ہو جاتا کہ وہ بہت بڑے بزرگ اور ولی

اللہ تھے اور جب کہ ایک معمولی مسلمان بھی شراب خوری اور رندی سے پرہیز کرتا ہے تو ایک ولی اللہ ان میں کیوں کر مبتلا ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ولایت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے شرعی پابندیوں کے ساتھ بہت زیادہ ریاضت اور نفس کشی کرنی پڑتی ہے۔ شراب خوری اور رندی کے ساتھ تزکیہ نفس حاصل نہیں ہوسکتا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا

اصلیت یہ ہے کہ فارسی یا اردو کے شاعر کے کلام سے اس کی اصل حالت کا اندازہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے کیوں کہ فارسی یا اردو شاعری میں خاص خاص عنوان مقرر ہیں ان ہی پر شاعری ہوتی ہے۔ خواہ رند ہو خواہ پارسا دونوں شاعری کے کوچہ میں یکساں ہیں۔ بڑے بڑے مقدس لوگ جن کے لبوں کو شراب کبھی چھو بھی نہیں گئی۔ وہ بھی شاعری کی شاہرہ میں بغل میں صراحی اور ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے نظر آئیں گے اور جام پر جام اڑائیں گے اس لیے کہ مشکل یہ ہے کہ صوفیانہ کلام میں وہ کیفیات بیان کی جاتی ہیں جو انسان کے دل پر ریاضت اور مجاہدے سے طاری ہوتی ہیں، ان کے بیان کرنے کے لیے دنیا کی کسی زبان میں الفاظ موجود نہیں ہیں، خواجہ خود اس دشواری کے متعلق کہتے ہیں:

چو ایں گرہ کشایم دیں ریش چوں نمایم

دردے و صعب دردے، کارے و سخت کارے

میں کیوں کر دل کی گرہ کھول کر اپنا زخم تم کو دکھلاؤں یہ تو نہایت ہی مشکل اور دشوار امر ہے۔

مجبوراً ان کیفیات کو عشق مجازی مئے و مستی اور گل و بلبل کے افسانوں میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور حقیقی مستی کی شراب طہور بادہ انگور سے تعبیر کی جاتی ہے۔ غالب نے صحیح کہا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شراب خواروں کے متعلق خواجہ کہتے ہیں:

مستی عشق نیست در سر تو

رو کہ تو مست آب انگوری

عشق کی مستی تمہارے اندر نہیں ہے تم یہاں سے چلے جاؤ کیوں کہ تم تو شراب انگور سے مست ہو۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حافظؔ و سعدیؔ وغیرہ حقیقت میں متقی اور پرہیزگار تھے تو ایسے ایسے باریک اور اعلا درجے کے رندانہ اور عاشقانہ مضامین کیوں کر ان کے دماغ میں آتے تھے۔ مگر جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ فارسی شاعری کی بنیاد انھیں مضامین پر ہے اور کوئی عاشق ہو یا نہ ہو لیکن اسی قسم کے مضامین لکھنے پڑتے ہیں تو یہ بات واضح ہوگئی کہ حافظؔ اور سعدیؔ وغیرہ کو بھی بحیثیت شاعر کے ایسے ہی خیالات ادا کرنے ضروری تھی اور باوجود صلاح وتقوے کے ایسے مضامین کا پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ایک مفلس اور محتاج شخص اپنے خیال میں اعلا سے اعلا جاہ وجلال کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ علاوہ بریں ان لوگوں کا زہد، زہد خشک نہ تھا۔ وہ اپنے دلوں میں عشق حقیقی کی آگ رکھتے تھے، اس وجہ سے عاشقانہ کلام میں جو گرمی وہ پیدا کر سکے دوسرا نہ کر سکا۔

اصلیت یہ ہے کہ فارسی یا اردو شاعری ایک بناوٹ کا نام ہے جس کے لیے واقعیت کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک مرتبہ آگرے میں مجھے ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاحب لحیم وشحیم صدر میں بیٹھے تھے، بلا مبالغہ ان کا وزن تین من سے کم نہ ہوگا۔ جب ان کے سامنے شمع آئی تو انھوں نے اپنی غزل سنانی شروع کی جس کا مطلع یہ تھا:

اس درجہ رنج ہجر نے لاغر کیا مجھے
بستر پر آ کے ڈھونڈ رہی ہے قضا مجھے

کہاں تو ان کا وہ تن و توش اور کہاں یہ لاغری۔ بھلا اس سے اصلیت کا اندازہ کیسے کیا جائے۔

یہاں تک کہ اردو میں جس میں تذکیر و تانیث کا امتیاز کیا جاتا ہے، کسی عورت کے لیے بھی اگر وہ شاعری کرے تو یہ لازم ہوگا کہ اپنے واسطے مذکر کا صیغہ استعمال کرے کیوں کہ اردو شاعری میں بھی فارسی کی طرح مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشق قرار پایا ہے، مثلاً ایک بیگم جس کا تخلص تاجور ہے کہتی ہے:

نہیں چین آتا اسے ایک دم بھی
ہوا تاجور جب سے شیدا کسی کا

اس تصنع کا کیا ٹھکانا ہے!

ہاں فارسی اور نیز اردو میں ایسے اشعار بھی ہوتے ہیں جن میں شاعر کسی اصلی واقعے کو ظاہر کرتا ہے لیکن وہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔

ایک یورپین مورخ خواجہ کے حالات لکھتے ہوئے بڑی دھوم دھام سے یہ روایت نقل کرتا ہے کہ جو ہمارے یہاں جہلا میں مشہور ہے کہ خواجہ ایک مفتی زادہ پر جس پر شاہ شجاع عاشق تھا فریفتہ ہو گئے۔ ایک دن اتفاق سے اس کے ساتھ محل شاہی کے پچھواڑے مے نوشی میں مشغول ہوئے۔ وہ اپنے خیالات میں خلوت میں تھے لیکن شاہ شجاع اس حرکت کو جھروکے سے دیکھ رہا تھا، جوں ہی خواجہ نے شراب کا پیالہ بھر کر مفتی زادہ کو دیا بادشاہ نے پکار کر کہا۔

حافظ قرابہ کش شد و مفتی شراب نوش

خواجہ کے لیے جب وہ ایک ناپسندیدہ کام میں مخفی طور پر مشغول تھے۔ یہ آواز بدحواس کر دینے والی تھی مگر انھوں نے اپنی تیزی طبیعت سے فوراً اس پر دوسرا مصرع

لگایا۔

در عہد بادشاہ خطا بخش و جرم پوش

شاہ شجاع اس حاضر جوابی پر پھڑک اٹھا اور خواجہ کی خطا سے درگزرا۔

اس روایت سے جو بھنگیر خانہ کی گپ سے زیادہ نہیں ہے اور جس کی ایک احمق سے احمق اور بھولے سے بھولا بچہ بھی تصدیق نہیں کرے گا، وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ حافظ بڑے شراب خور اور عشق باز تھے اور لطف یہ ہے کہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ یہ بھی لکھتا ہے کہ حقیقت میں شاہ شجاع کی عیاشی کی وجہ سے اس کے زمانے میں شراب خواری اور عشق بازی کا بہت زیادہ چرچا ہو گیا تھا"

کاش اس مورخ نے کوئی تاریخ بھی فارس کی اٹھا کر پڑھی ہوتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ تمام شاہان شیراز میں شاہ شجاع بہت بڑا عالم اور نہایت درجے کا پابند شرع اور حافظ قرآن تھا، خود خواجہ اس کی تعریف میں کہتے ہیں:

مظہر لطف ازل، روشنی چشم امل

جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

اس کا زمانہ شیراز کے لیے شریعت اور مذہب کا زمانہ تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ امیر مظفر نے شراب خانے بند کر دیئے تھے اور شاہ شجاع کے زمانے میں تجارت کی آزادی کی وجہ سے پھر شراب کی دکانیں کھل گئیں۔ اسی کا بعض جگہ خواجہ نے مذاق اڑایا ہے:

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش

کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

صبح کو ہاتف غیب نے یہ خوش خبری میرے کانوں کو سنائی کہ شاہ شجاع کا زمانہ ہے، کھلے بندوں شراب پیو۔

ایسے متشرع بادشاہ اور حافظ جیسے ولی اللہ کے متعلق اس قسم کا غلط اندازہ کرنا

فارسی تاریخ سے جہالت کی دلیل ہے۔

اور دیکھو تو خلوت بھی تلاش کی تو کہاں؟ شاہی محل کے پچھواڑے، جہاں بادشاہ خود ہی جھانکتا ہو۔ سبحان اللہ

جاسوس سلطاں در کین معشق سلطاں در بغل

تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ خواجہ بہت بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے۔ ہر شب جمعہ کو قرآن ختم کرتے تھے اور رات کے پچھلے حصے میں اوراد و ظائف پڑھتے تھے۔ ان کے تمام اوقات علمی مشغلوں ریاضت اور عبادت میں صرف ہوتے تھے، پھر اس قسم کے ہفوات اور ان کے دامن میں زہد و اصلاح پر کیا دھبہ لگا سکتے ہیں۔

چارلس اسٹورٹ جس نے سلطان ٹیپو کے کتب خانے کی فہرست مرتب کی ہے، لکھتا ہے کہ

"حافظ پرہیز گاری میں بہت مشہور رہے۔ اس کا تمام وقت خدا کی عبادت اور ریاضت میں صرف ہوتا تھا۔ فارس کے لوگ اس کو ایک ولی اللہ اور مقدس بزرگ سمجھتے ہیں اور عاشقان الٰہی اس کا کلام کثرت سے پڑھتے ہیں۔"

خود دیوان میں ایسے بتہ سے اشعار ہیں جن سے ان کے زاہد و عابد ہونے کا پتہ لگتا ہے، مثلاً:

ہر گنج سعادت کہ خدا داد بہ حافظؔ

از یمن دعائے شب و ورد سحری بود

نیک بختی کا جو ذخیرہ کہ خدا نے حافظ کو عنایت کیا ہے، وہ دعائے شب او وظیفہ سحری کی برکت سے ملا ہے۔

بہ ہیچ ورد دگر نیست حاجت اے حافظؔ

دعائے نیم شب و وردِ صبحگاہت بس

حافظ تجھ کو کسی دوسرے ذریعے کی حاجت نہیں ہے، آدھی رات کی دعا اور صبح کا وظیفہ تیرے لیے کافی ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ مفتاح التواریخ کا مصنف طامسن ولیم لکھتا ہے کہ خواجہ کے ایک کرم فرما امین الدین حسن اصفہان کے بہت بڑے رئیس تھے۔ خواجہ ان کی ملاقات کو گئے۔ جب اصفہان پہنچے تو قبل اس کے کہ ان سے ملیں، ان کے غلاموں نے ان کو شرابی سمجھ کر پکڑ لیا اور تشہیر کرنی شروع کی۔ آدھے شہر میں تشہیر کر چکے تھے کہ امین الدین کو خبر لگ گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے، خواجہ سے معافی مانگی اور عزت و احترام کے ساتھ لا کر ان کو اپنے مکان میں اتارا۔ غلاموں کو سزائیں دیں۔ خواجہ نے شکر گزاری میں یہ غزل لکھی۔

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا داران کویش را چوں جان خویشتن دارم
مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش
فراغ از سرو بستانی شمشاد چمن دارم
بکام و آرزوئے دل چو دارم خلوتے حاصل
چہ فکر از خبث بد گویان انجمن دارم!
صفائے خلوت خاطر ازاں شمع چگل جویم
فروغ چشم و نور دل ازاں ماہ ختم دارم
گرم صد لشکر از خوباں بقصد دل کمیں سازند
بحمد اللہ و المنتہ بت لشکر شکن دارم
سزد کہ خاتم لعلش ز نم لاف سلیمانی
چو اسم اعظم باشد چہ باک از اہرمن دارم
خدارا اے رقیب! امشب زمانے دیدہ برہم نہ

کہ من با لعل خاموشش نہانی صد سخن دارم

الا اے پیر فرزانہ مکن عیبم ز میخانہ

کہ من در ترک پیمانہ دل پیماں شکن دارم

شراب خوش گوارم ہست دیار چوں نگارم ہست

ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

برندی شہرہ شد حافظؔ میان ہمدماں لیکن

چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم

اس مقطع کو دیکھ کر غالباً یہ روایت گھڑی گئی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور کئی ایک روایتیں جہلا کی محفلوں کو گرمانے کے لیے بھانڈوں اور نقالوں نے تراش رکھی ہیں جو اپنی تردید آپ ہی کرتی ہیں۔

کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ غلاموں نے بدمستی میں تشہیر کرنی شروع کی۔ دنیا میں کہیں ایسے غلام دیکھے نہ سنے جو قاضی و محتسب شہر کے فرائض بجالاتے ہوں۔

ہمارے نزدیک یہ سب روایتیں خواجہ کی عظمت اور ہر دلعزیزی کی دلیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف پڑھے لکھے لوگوں میں وہ مقبول ہیں بلکہ جہلا اور عوام بھی ان کے ساتھ کم دلچسپی نہیں رکھتے اور محفلوں میں ان کا ذکر چھیڑنے کے لیے طرح طرح کی عجیب وغریب روایتیں گھڑتے ہیں۔

خواجہ کے اوپر ان کی زندگی ہی میں معتزلی ہونے کا الزام البتہ لگایا گیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو تفسیر کشاف سے کو ایک معتزلی پیشوا علامہ جاراللہ زمخشری کی تصنیف ہے، عشق تھا۔ چناں چہ انھوں نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ بعض لوگوں نے اسی وجہ سے ان کو معتزلی کہا۔

محمد دارابی نے اس الزام کو خواجہ پر رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ خواجہ معتزلی نہ تھے اس وجہ سے کہ معتزلہ، بندے کو اپنے افعال کا خالق اور مختار

مانتے ہیں اور خواجہ مجبور محض سمجھتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظؔ
تو در طریق ادب باش گو گناہ من است

اے حافظؔ اگرچہ گناہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے لیکن تو از روئے ادب کے یہی کہہ کر میں نے ہی گناہ کیا۔

علاوہ بریں معتزلہ خدا کی روایت کے قائل نہیں ہیں اور خواجہ کہتے ہیں:

ایں جان عاریت کہ بحافظؔ سپرد دوست
روزے رخش بینم و تسلیم وے کنم

اس شعر سے ثابت ہو گیا کہ وہ اشعری ہیں نہ کہ معتزلی۔

وفات کے دو سو برس بعد تک ان کے معتزلی اور اشعری ہونے کا جھگڑا رہا۔ بعد ازاں قاضی نور اللہ صاحب شوستری نے اپنی کتاب مجالس المومنین میں جہاں تمام بڑے بڑے سنیوں، حتیٰ کہ ہارون الرشید خلیفہ عباسی اور شیخ سعدیؒ کو بھی اہل تشیع میں داخل کیا ہے، وہاں خواجہ کو بھی اسی فہرست میں درج کیا ہے اور ثبوت میں یہ غزل نقل کی ہے:

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم
یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم (۱)

اس غزل میں خواجہ نے منصور کی مداح کی ہے، اس کے آخر کے اس شعر سے:

حافظؔ ز جاں محب رسولؐ ست و آل او
بر ایں سخن گو است خداوند اکبرم (۲)

حافظؔ جان سے رسولؐ کو اور ان کی اولاد کو دوست رکھتا ہے اس بات پر خداوند عالم گواہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱: آیمنی اور نذیر احمد کے یہاں یہ غزل نہیں ہے۔
۲: قزوینی کے یہاں یہ شعر نہیں؛ مقطع یہ ہے: مقصود از ایں معاملہ بازار تیزیست
نے جلوہ می فروشم نے عشوہ می خرم

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قاضی صاحب خواجہ کو شیعہ کہتے ہیں، مگر اس سے ان کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے اولاد کی محبت تو ہر سنی بھی رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے زمانے تک وہ تمام غزلیں، قصیدے اور رباعیاں وغیرہ جن سے صاف صاف خواجہ کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے، دیوان میں داخل نہیں کی گئی تھیں ورنہ قاضی صاحب ان کو ضرور لکھتے۔

یہ مقطع بھی ایک قلمی دیوان میں جو ۹۸۱ھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح ہے:

حافظؔ بجان دعائے تو گوید بہ صبح و شام
بر ایں سخن گواست خداوند اکبرم

سلسلۂ کلام کے لحاظ سے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہاں رسولؐ اور آل رسولؐ کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اہل تشیع کے یہاں جنازہ کی نماز میں پانچ تکبیریں ہوتی ہیں اور خواجہ فرماتے ہیں:

من ہمہ دم کہ وضو سلختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

میں نے جس وقت عشق کے چشمے سے وضو کیا اسی وقت تمام چیزیں پر چار تکبیریں (نماز جنازہ) پڑھ دیں۔

شیعوں کی طرف سے خود خواجہ پر دو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کہتے ہیں:

ببیں ہلال محرم بخواہ ساغر راح

کہ ماہ امن اور امانست و سال صلح و صلاح (۱)

محرم کا ہلال دیکھو اور شراب کا پیالہ پیو کیوں کہ امن کا و امان کا مہینا اور بہتری اور بہبودی کا سال ہے۔

شیعوں کے نزدیک محرم کا مہینا سوگ اور ماتم کا مہینا ہے۔ کیوں کہ امام حسین علیہ السلام اس میں شہید ہوئے اور وہ محرم کا ہلال دیکھتے ہی جام شراب طلب کرتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ لوگ تبرکاً و تیمناً اپنی کتاب کو اللہ اور رسولؐ کی تعریف یا قرآن کی کسی آیت سے شروع کرتے ہیں اور خواجہ نے اپنے دیوان کو یزید کے مصرع سے شروع کیا ہے۔

انا المسموم ما عندی بتریاق والا راقی

ادر کاسئا و ناولہا الا یا ایہا السّاقی

مجھ کو زہر دیا گیا ہے نہ میرے پاس تریاق ہے نہ منتر پڑھنے والا ہے، اے ساقی ساغر کا دور چلا اور پیالہ عنایت کر۔

خواجہ نے اس کے دوسرے مصرع میں ذرا سا تغیر و تبدل کرکے اسی سے اپنا دیوان شروع کیا۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اہل شیرازی نے گو کہ خواجہ کی طرف سے معذرت کی ہے اور یہ قطعہ لکھا ہے کہ:

خواجہ حافظ را شبے دیدم بخواب

گفتم اے در فضل و دانش بے مثال

از چہ بستی بر خود ایں شعر یزید

با وجود ایں ہمہ فضل و کمال
گفت واق نیستی زیں مسئلہ
مال کافر ہست بر مومن حلال

☆☆☆☆☆☆

ا: نائینی ونذیر احمد کے یہاں یہ غزل ہی نہیں۔قزوینی کے یہاں غزل تو، اس ردیف میں ہے لیکن اس میں یہ شعر نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

لیکن کاتبی نیشاپوری راضی نہیں ہوتا وہ کہتا ہے کہ" ایک شیر کے لیے یہ ننگ ہے کہ کوئی کتا منہ میں نوالہ لیے ہوئے جارہا ہو اور وہ اس کو چھین لے" چناں چہ اس نے لکھا ہے:

عجب در حیرتم از خواجہ حافظؔ
بنوعے کش خرد زاں عاجز آید
چہ حکمت دید در شعر یزید او
کہ در دیوان نخست از وے سراید
اگرچہ مال کافر بر مسلماں
حلال است و درد نہ قولے نشاید
ولے از شیر عیبے بس بزرگ است
کہ لقمہ از دہان سگ رہاید

ہم اس معاملہ میں حیران تھے کہ خواجہ کو کس فرقے میں شمار کریں۔معتزلی کہتے ہیں تو سنّی خفا ہو جاتے ہیں۔سنی کہتے ہیں تو شیعہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ آخر خود ہم نے خواجہ سے سوال کیا کہ بتایئے آپ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔آزاد منش خواجہ نے جواب دیا:

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ ایک درویش کامل اور صوفی باصفا تھے۔ وہ اس تفرقے کے جال سے جو ظاہری تقلید سے پیدا ہوئے ہیں، بالکل آزاد تھا۔ وہ مذہب کی وسعت کو سمجھتے تھے اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا درجہ فرقہ بندی کی دسترس سے بہت بلند تھا۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلندست آشیانہ

ذاتی حالات

خواجہ کی زندگی درویشانہ اور فقیرانہ زندگی تھی۔ ان کے تمام اوقات علمی، مشاغل عبادت اور ریاضت میں صرف ہوتے تھے۔ سیر چشمی اور فیاضی جو بزرگوں کا خاصہ ہے، ان میں بدرجہ کمال موجود تھی اور دنیاوی جاہ و مال کی خواہش سے ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی تمام آمدنی فقرا اور درویشوں کے لیے وقف تھی اور بیگانہ اور آشنا سب کے لیے ان کا دروازہ کھلا رہتا تھا:

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر چہ خواہد گو بگو
کبر و ناز و حاجب و درباں بدیں درگاہ نیست

ان کی روزی بادشاہوں اور امراء کی فیاضی پر منحصر نہ تھی۔ بلکہ وہ مدرسے میں تعلیم دیتے تھے اور اس کی آمدنی سے گزارا کرتے تھے۔ ان کی ایک بہن چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مری تھی، ان کی پرورش بھی انھیں کے ذمے تھی۔

وہ مجذوب صوفی یا آزاد مجرد نہ تھے۔ انھوں نے شادی بھی کی تھی اور ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹا نوعمری کی حالت میں مر گیا۔ اس کے مرثیے میں ایک غزل لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

بلبلے خون دلے خورد و گلے حاصل کرد

باد غیرت بصدش خار پریشاں دل کرد

طوطی را بخیال شکرے دل خوش بود

ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد

آہ و فریاد کہ از چشم حسو و مہ چرخ

در لحد ما کمال ابروئے من منزل کرد

بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ کی اہلیہ بھی جو ایک نیک سیرت اور حسین و جمیل بیوی تھیں عین شباب ہی کے زمانے میں انتقال فرما گئیں۔ خواجہ کو ان کی موت سے ایسا صدمہ ہوا کہ پھر دوسرا نکاح نہیں کیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ غزل ان ہی کے مرثیے میں لکھی ہے:

آں یار کز و خانۂ ما جائے پری بود

سر تا قدمش چوں پری از عیب بری بود

از چنگ منش اختر بد مہر بدر برد

آرے چہ کنم دولت دور قمری بود

دوسرے بیٹے کا نام شاہ نعمان تھا۔ وہ ہندوستان آئے تھے۔ برہان پور میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی قبر بھی وہیں قلعہ آسیر کے قریب ہے۔

حبّ وطن

وطن کی محبت کم وبیش ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن شعراء کے اندر جن کا احساس عام لوگوں سے زیادہ تیز اور لطیف ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ خواجہ کے جس طرح تمام شاعرانہ جذبات نہایت بلند تھے، اسی طرح حب وطن کا بھی جذبہ ان میں بہت بلند تھا۔

وطن بھی کیسا وطن! شیراز جیسا مینو سواد۔ عروس البلاد وطن جہاں کی آب و ہوا نہ

زیادہ گرم ہے نہ سرد ہے بلکہ نہایت معتدل اور خوش گوار ہے اور جو صدیوں تک شاہان فارس کا پایہ تخت رہا ہے، جس کی خاک سے سیکڑوں بڑے بڑے نامور علما، فضلا اور اہل کمال پیدا ہوئے جن کے کارنامے اور تصنیفیں اب تک مسلمانوں کے لیے مایۂ ناز ہیں۔

اکثر شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اس شہر کی اور یہاں کے باشندوں کی مدح کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیراز کو ہر دلعزیز بنانے والے وہی چند اشعار ہیں جو خواجہ نے اس کی تعریف میں لکھ دیئے ہیں: سعدی کہتے ہیں:

دست از دامنم نمی دارد
خاک شیراز و آب رکنا باد

شیراز کی خاک اور رکنا باد کا چشمہ دونوں میرا دامن نہیں چھوڑتے ہیں

خواجہ فرماتے ہیں:

نمی دہند اجازت مرا بسیر و سفر
نسیم باد مصلا و آب رکنا باد

باد مصلے کی نسیم اور رکنا باد کا چشمہ دونوں میرا دامن نہیں چھوڑتے ہیں

خواجہ کو اپنے دل فریب وطن اور اس کی پر فضا سیر گاہوں سے اس قدر محبت تھی کہ وہ کہیں دوسری جگہ آنا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ یزد والوں کے بڑے اصرار سے وہاں تشریف لے گئے۔ شیراز کی یاد میں کیسا آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں:

نماز شام غریباں چو گریہ آغازم
بمویہ ہائے غریبانہ قصہ پردازم
بیاد یاد و دیار آنچنان بگریم زار
کہ از جہاں رہ و رسم سفر بیندازم

هوائے منزل یار آب زندگانی ماست
صبا بیار نسیمے ز خاک شیرازم

انھوں نے شیراز کی تعریف میں یہ غزل بھی لکھی ہے ''جو غزل شیرازی'' کے نام سے مشہور ہے:

خوشا شیراز و وضع بے مثالش
خداوندا نگہدار از زوالش
میان جعفر آباد و مصلّےٰ
عبیر آمیز مے آید شمالش
بشیراز آے و فیض روح قدسی
بجو از مردم صاحب کمالش
کہ نام قند مصری برد آنجا
کہ شیرینان ندادند انفعالش
صبا زاں لولی شنگول سرمست
چہ داری آگہی چونست حالش
مکن از خواب بیدارم خدارا
کہ دارم خلوتے خوش با خیالش
چرا حافظ چو میترسیدی از ہجر
نکردی شکر ایام وصالش

شیراز کے مشرقی سمت میں دو میل کے فاصلے پر ایک مسطح اور خوش نما مرغزار ہے جس کا نام خاک مصلّےٰ ہے۔ اس میں ہمیشہ قدرتی سبزہ کا فرش بچھا رہتا ہے اور بہار کے زمانے میں رنگ برنگ کے خودرو پھول اس کثرت سے کھل جاتے ہیں کہ تمام میدان گل زار بن جاتا ہے۔ اسی میں ہر کنی یا رکنا باد جاری (۱) ہے جو رکن الدولہ

ویلمی نے نکالی تھی اور جس کا پانی نہایت صاف شفاف اور شیریں ہے۔خواجہ اس کی مدح میں کہتے ہیں:

بدہ ساقی مئے کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلاً را

اس نہر کے منبع کا نام ''اللہ اکبر'' ہے۔ خواجہ نے ایک غزل میں لکھا ہے۔

فرق است زابِ خضر کہ ظلمات جائے اوست
تا آبِ ما سنبعش اللہ اکبر ست

''خضر کے چشمہ آب حیات میں کہ ظلمات میں ہے اور ہمارے اس چشمہ میں جس کا منبع اللہ اکبر ہے، بڑا فرق ہے''

شیراز کی اکثر سیر گاہیں اور باغات بھی اسی جانب واقع ہیں اور یہ قطعۂ زمین ایک نہایت پر فضا مقام ہے۔خواجہ کی طبیعت چوں کہ فطرتاً شاعرانہ تھی اس لیے وہ قدرتی مناظر نہایت دل فریب اور پر فضا مقامات کو جہاں کسی قدر تنہائی بھی ہو، زیادہ پسند کرتے تھے۔اسی وجہ سے خاک مصلا ان کو بہت پیاری تھی۔اکثر اپنے فرصت کے اوقات میں وہیں چلے جاتے تھے اور دل بہلاتے تھے۔

تمام دنیا پر اس کو ترجیح دیتے ہیں:

شیراز و آب رکنی و ایں باد خوش نسیم
عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است

شیراز اور چشمہ رکنی اور اس اچھی نسیم والی ہوا کو برا نہ کہو، کیوں کہ یہ تمام دنیا کے چہرے کا تل ہے۔

وفات

تقریباً ۷۶ سال کی عمر میں، عشا کے وقت، دو شنبہ کیدن ۱۷ ذوالحجہ ۷۹۱ھ کو خواجہ نے شیراز ہی میں وفات پائی، جنازے پر خلقت کا بڑا ہجوم تھا۔شہر کے تمام

امراء ورؤساحتی کہ منصور بن ظفر بادشاہ وقت بھی شریک تھا۔ خواجہ کو چوں کہ خاک مصلا سے اپنی زندگی میں بہت الفت تھی اس لیے لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اسی مقام میں ان کو دفن کرنا چاہیے

قبر بلبل کی بنے گلزار میں

چنانچہ اسی میں وہ ایک شمشاد کے درخت کے نیچے جس کو انھوں نے خود لگایا تھا دفن کیے گئے۔ لطف یہ ہے کہ ''خاک مصلا''ہی سے ان کی وفات کی تاریخ بھی نکل آئی۔ اسی زمانے کے کسی شاعر نے جس کا نام نہ معلوم ہو سکا اس کو نظم کر کے اس طرح قطعہ تاریخ بنا دیا:

چراغ اہل معنی خواجہ حافظؒ
کہ شمعے بود از نور تجلیؐ
چو در خاک مصلے ساخت منزل
بجو تاریخش از خاک مصلےٰ ۷۹۱ھ

خواجہ کا مزار خاک مصلےٰ کے جس حصے میں ہے وہ ان ہی کے نام سے حافظیہ کہلاتا ہے، اس سے دو سو گز فاصلے پر مغرب کی طرف مسجد مصلےٰ ہے۔

خواجہ کی قبر جیسا کہ انھوں نے خود کہا تھا:

بر سر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

ہماری قبر پر جب تمہارا گزر ہو تو دعا مانگو کیوں کہ ہماری قبر دنیا بھر کے رندوں کی زیارت گاہ ہوگی

ایک مشہور زیارت گاہ ہے۔ دور دور سے لوگ خاص کر فقرا اور درویش اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور حلقۂ دور میں ایک جام ان کے نام سپرد خاک کرتے ہیں۔

۸۸۵ھ میں جب سلطان ابو القاسم بابر بہادر نے شیراز پر قبضہ کیا تو مولانا محمد معمائی نے جو سلطان مذکور کے وزیر تھے، خواجہ کی قبر پر ایک خوشنما گنبد بنوا دیا۔

کریم خاں زند نے اپنے عہد حکومت میں باغ مصلے کو جس میں رکنی نہر جاری ہے درست کرایا اور وہاں درویشوں کے رہنے کے لیے ایک خانقاہ بھی بنوا دی۔ تربت پر سنگ مرمر کا ایک خوب صورت تختہ لگوا کر نہایت خوشنما نستعلیق خط میں بیچ میں یہ غزل کندہ کرائی:

مژدۂ وصل تو کو کز سر جاں برخیزم
طائر قدسم و از دام جہاں برخیزم

یارب از ابر ہدایت برساں بارانے
پیشتر زانکہ چوں گردے ز میاں برخیزم

بر سر تربت من با مئے و مطرب بنشیں
تا بہ بویت ز لحد رقص کناں برخیزم

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم کش
تا سحر گہ ز کنار تو جواں برخیزم

روز مرگم نفسی مہلت دیدار بدہ
تا چو حافظ ز سر جان و جہاں برخیزم

حاشیہ پر یہ غزل کندہ ہے:

اے دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

از خارجی ہزار بیک جو نمے خرند
گو کوہ تا بکوہ منافق سپاہ باش

چوں احمدم شفیع بود روز رستخیز

گو این تن بلا کش ما پر گناه باش
امروز زنده ام بولائے تو یا علیؓ
فردا بروح پاک امامان گواه باش
آنرا که دوستی علیؓ نیست کافر است
گو زاہد زمانہ و گو شیخ راه باش
مرد خدا که زاہد و تقوے طلب بود
خواہی سفید جامہ و خواہی سیاه باش
قبر امام ہشتم سلطان دین رضا
از جان ببوس و بر در آن بارگاه باش
دست نمی رسد که بچینی گلے ز باغ
بارے بپائے گلبن ایشان گیاه باش
حافظ طریق بندگی شاه پیشہ کن
وانگاه در طریق چون مردان راه باش

لیکن یہ غزل خواجہ کی نہیں ہے۔ کریم خاں کی زند نے کسی سے تصنیف کرا کے لکھوائی ہے۔ کیوں کہ بارھویں صدی سے پہلے یعنی کریم خان زند کے پیشتر کے دیوان حافظ کے نسخوں میں نہیں پائی جاتی۔ ہمارے پاس اس وقت چار نسخے ہیں۔ ایک ۹۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا ۹۸۱ھ کا تیسرا ۱۰۹۳ھ کا چوتھا ۱۲۰۸ کا۔ ان میں سے پہلے تینوں نسخوں میں نہیں ہے، صرف چوتھے میں ہے۔ مولانا سودیؒ کے نسخے (جس کا ذکر آگے آئے گا) میں بھی نہیں ہے۔ بکنل لکھتا ہے کہ "تعلیم یافتہ ترکوں نے عام طور پر مجھ سے کہا کہ یہ غزل کسی غیر شخص نے لک کر دیوان میں داخل کر دی ہے۔(۱)"

☆☆☆☆☆

ا: قزوینی اور نائینی ونذیر احمد کے یہاں بھی یہ غزل نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

تصنیفات

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نے تفسیر کشاف پر ایک حاشیہ لکھا تھا۔ ہم نے اس کو بہت تلاش کیا مگر افسوس ہے کہ نہیں مل سکا۔ کشف الظنون اور اکسیر میں جہاں ان کتابوں کی فہرست درج ہے جو علوم قرآنیہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، وہاں تفسیر کشاف کے حاشیوں، شرحوں اور خلاصوں کو بھی نام بنام لکھا ہے، ان میں خواجہ کے حاشیہ کا ذکر نہیں ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواجہ نے حاشیہ ہی نہیں لکھا، کیوں کہ شیراز کے علماء نے اور خاص کر اسی صدی کے علماء نے جس میں خواجہ موجود تھے کشاف کے متعلق کتابیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر وہاں کے علماء کے حلقے میں دلچسپی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ پھر خواجہ نے جو تفسیر ہی پڑھاتے تھے اور اس فن سے خاص ذوق رکھتے تھے، کچھ عجب نہیں کہ اس تفسیر پر جو ان کو بہت پسند تھی، حاشیہ لکھا ہو۔ وہ خود کہتے ہیں:

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد

لطائف حکماء با کتاب قرآنی

دنیا بھر کے حافظوں میں سے میری طرح کسی نے بھی فلسطیوں کے اقوال کو قرآن کے ساتھ مطابق نہ کیا۔

مگر چوں کہ سہل پسند طبیعتوں نے خود کشاف ہی کو جو ایک دقیق کتاب ہے، ترک کر دیا تو اس کے حواشی اور شروح کی طرف ان سے توجہ کرنے کی کیا توقع ہو سکتی تھی اس لیے یہ قیاس کرنا غالباً صحیح ہوگا کہ خواجہ کا حاشیہ بھی من جملہ اور تصانیف کے علمی بے اعتنائی کا شکار ہو گیا۔ ان کی اس وقت جو یادگار ہے وہ دیوان ہے۔

خواجہ اپنے علمی مشاغل اور صوفیانہ ریاضتوں کی وجہ سے اپنے کلام کو جو ان کی

طبیعت کا ایک ادنا کرشمہ تھا، کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی زندگی میں انھوں نے اس کے جمع کرنے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد محمد گلندام نے جو ان کے معتقدوں میں سے تھے، دیوان کو مرتب کیا۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی تعلیم، بادشاہ کی ملازمت، کشاف اور مصباح پر حاشیہ لکھنے، مطالع اور مفتاح کے مطالعے، علم وادب کی تحصیل اور شعراء عرب کے دواوین کی جستجو میں وہ ایسے مصروف رہے کہ اپنے اشعار اور غزلوں کو جمع نہیں کر سکے“۔

دیوان کی ترتیب اسی اصول پر ہے جس اصول پر دیگر شعراء فارس کے دواوین کی ہے۔ حروف تہجی کے سلسلے کے مطابق الف سے یے تک ردیف وار غزلیں درج کی گئی ہیں، البتہ پ، چ، ز، ذ اور گ کی ردیف پر کوئی غزل نہیں ہے۔

سب سے زیادہ جو امر افسوس ناک ہے وہ یہ ہے کہ خواجہ کے کلام میں دوسروں کا کلام خلط ملط کر دیا گیا ہے اور بہت سی غزلیں اور قصیدے غیروں کے اس میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں بہت سے اسباب ہیں۔

ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کو لوگوں میں پھیلانا چاہتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت اور عزت لوگوں میں اس قدر نہیں ہوتی کہ ان کے خیالات کی وقعت ہو، اس لیے وہ کسی بڑے آدمی کے نام کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تا کہ لوگ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ حضرت علیؓ کے کہے ہوئے بہت تھوڑے اشعار ہوں گے لیکن ان کے نام سے سیکڑوں آدمیوں نے اپنے اپنے خیالات عوام میں پھیلانے کی کوشش کی، چنانچہ ان کی وفات کے کئی صدی کے بعد ان کے نام سے پورا دیوان تیار کر لیا گیا۔ اسی طرح حافظؔ کے نام سے بھی بہت سی غزلیں اور رباعیاں گھڑ کر لوگوں نے ان کے دیوان میں داخل کر دیں۔ دوسرے شعراء کا بھی جو کلام ان کو پسند آیا اس کو بھی انھوں نے حافظؔ کا قرار دے دیا۔ رضا قلی

لکھتا ہے کہ سلمان ساوجی متوفی ۷۷۸ھ جو بغداد کے ایلخانی دربار کا بڑا معزز شاعر تھا، اس کا بھی کچھ کلام لوگوں نے اس کے دیوان سے خواجہ کے دیوان میں شامل کر دیا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ سلطان مرزا شاہ رخ کے درباریوں میں ایک حافظ حلوائی تھا جو حافظ شیرازی کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس کا شعر ہے:

حافظ حلوائیم و در کمال
معتقد حافظ شیرازیم

بعض لوگوں نے غلط فہمی سے اس کے بعض قصیدے اور غزلیں خواجہ کی سمجھ کر ان کے دیوان میں داخل کر دیئے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں نے خواجہ کو شیعہ کہنے کے لیے ان کے دیوان میں ایسا کلام ملحق کیا تھا جس سے ثابت ہو کہ وہ شیعہ تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس قسم کی غزلیں اور قصیدے اہلی شیرازی (۱) یا اس کے ہم عصر کی تصنیف سے ہیں۔

الحاق کرنے والوں نے بھی غضب کیا ہے۔ عمر خیام کی بہت سی رباعیاں نقل کر لی ہیں اور تو اور شیخ سعدیؒ کے دیوان کے بیسیوں مشہور اشعار خواجہ کے دیوان میں داخل کر دیئے ہیں، مثلاً:

باز آ کہ در فراق تو چشم امیدوار
چوں گوش روزہ دار بر اللہ اکبر ست
خیال روے کسی در سرست ہر کس را
مرا خیال کسے کز خیال بیروں ست

☆☆☆☆

(۱) اہلی شیرازی شاہ اسمٰعیل صوفی کے درباری شعرا میں سے تھا، ۹۴۲ء میں وفات پائی، خواجہ حافظ کے مقبرہ میں مدفون ہوا۔ ایک دیوان اور مثنوی سحر حلال یادگار ہے۔

☆☆☆

گنج آزادگی قناعت ملکے ست

کہ بہ شمشیر میسر نشود سلطاں را

مندرجہ ذیل پوری غزل شیخ کی بہ تبدیل تخلص دیوان حافظ کے ان نسخوں میں جو بمبئی یا کانپور وغیرہ میں چھپے ہیں، شامل کی گئی ہے۔

برخیز تا طریق تکلف رہا کنیم

دکان معرفت بدو چو پر بہا کنیم

گر دیگر آں نگار قبا پوش بگذرد

ما نیز جامہائے تصوف قبا کنیم

ہفتاد زلت از نظر خلق در حجاب

بہتر ز طاعتے کہ بروے و ریا کنیم

آں کو بغیر سابقہ چندیں نواخت کرد

ممکن بود کہ عفو کند گر خطا کنیم

سعدی وفا نمی کند ایام سست مہر

ایں پنج روزہ عمر بیا تا وفا کنیم

لاہور کے چھپے ہوئے اور نیز دیوان حافظ کے دوسرے نسخوں میں بھی شیخ کا یہ مشہور شعر جس کو گلستاں پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں، موجود ہے:

یا مکن با پیل بانان دوستی

یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

اس سے زیادہ بدیہی مثال الحاق کی اور کیا ہو گی۔

دیوان کا ایک نسخہ اٹھا لیجئے اور دوسرے نسخے سے ملا کر دیکھئے، سیکڑوں اشعار کا فرق نظر آئے گا۔ غزلیات کی ترتیب ایک نسخہ کی اور ہے اور دوسرے کی اور۔ ایک

میں اگر چار سو غزلیں ہیں، تو دوسرے میں پانچ سو۔ سو غزلوں کا فرق پڑ جاتا ہے۔

شکر ہے کہ سب سے پہلے گیارہویں صدی ہجری کے ابتدا میں ایک ترک عالم مولانا سودیؒ نے جو بوسینیا کے باشندے تھے، دیوان کو غالباً ویانا میں طبع کرایا۔ اس کی نقل دوبارہ اور سہ بارہ لیپزک اور ویانا میں طبع ہوئی۔ کچھ زمانہ ہوا قسطنطنیہ میں بھی چھاپی گئی ہے۔

مولانا سودیؒ نے نویں اور دسویں صدی ہجری کے دیوان کے بہت سے قلمی نسخے جمع کیے۔ ان کا مقابلہ کرکے نہایت تصحیح کے ساتھ طبع کرایا۔ ہمارے پاس جو قلمی نسخہ دیوان کا ۹۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اس کو مولانا سودیؒ کے نسخے سے ملا کر ہم نے دیکھا، سوائے غزلوں کی ترتیب کے کچھ زیادہ فرق نہیں پایا۔

عام بازاری نسخوں سے مولانا سودیؒ کے نسخے میں ۶۰-۷۰ غزلیں کم ہیں۔

بمبئی کے مطبع فتح الکریم کے چھپے ہوئے نسخے میں ۵۹۲ غزلیں ہیں۔ مسٹر جیرٹ کے نسخے میں ۵۷۳ اور مولانا سودی کے نسخے میں ۵۲۸، علاوہ بر ایں ۲۰۱ شعر جو مختلف غزلوں میں داخل کر دیے گئے ہیں مولانا سودی کے نسخے میں نہیں ہیں۔

قصیدوں کی کیفیت یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں سے کسی میں کوئی قصیدہ نہیں ہے، کسی میں چار ہیں کسی میں پانچ۔ ہمارے ۹۵۲ھ کے نسخے میں ایک بھی نہیں ہے۔ ۱۲۰۸ھ کے نسخے میں سات ہیں۔

مگر عام طور پر قلمی نسخوں میں کوئی قصیدہ نہیں پایا جاتا۔

برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدے کے ہیں، مثلاً ابوالفتح شیخ محمد بن اسرائیل ساکن کول کا لکھا ہوا نسخہ جمادی الاوّل ۱۰۲۰ھ کا بلا قصیدے کے ہیں۔ سلمان الفو شعبجی کے نسخے میں بھی کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ عبدالرشید مولانا عبداللطیف ترکمان دہلی کا نسخہ بھی جو ۱۰۵۳ھ کا لکھا ہوا

ہے، بلا قصیدے کے ہے۔ عبداللہ تبریزی کے نسخے میں بھی کوئی قصیدہ نہیں ہے۔

بانکی پور کے کتب خانے کی قلمی کتابوں کی فہرست جو انگریزی میں مولوی عبدالمقتدر خاں صاحب نے مرتب کی ہے اور سال گذشتہ میں کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، اس میں انھوں نے دیوان کے کئی قلمی نسخوں کا پتا دیا ہے۔ ان میں سے اکثر میں صرف یہ ایک قصیدہ ہے۔

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم

یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

مسٹر رچ کے سیکرٹری نے ۱۸۲۱ء میں جو نسخہ اس دیوان سے نقل کیا ہے، جو خواجہ کے مزار پر رکھا رہتا ہے اور جو انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے، اس میں بھی صرف یہی ایک قصیدہ ہے۔ قاضی نور اللہ صاحب نے اس قصیدے کو بھی غزل لکھا ہے اور ہمارے پرانے نسخے میں اس کا نہ غزلیات میں پتا ہے نہ قصائد میں۔ ترکیب بند کا کسی پرانے نسخے میں پتا نہیں ہے۔ ہم خود حیرت میں ہیں کہ یہ ترکیب بند شاہ ناصر الدین کی مدح میں لکھا گیا ہے اور اس صدی میں تمام فارس میں ناصر الدین نام کا کوئی بادشاہ ہم کو نہیں ملتا۔ پھر یہ خواجہ کا کیسے ہو سکتا ہے۔ ترجیع بند بھی پرانے نسخے میں نہیں ہے، نہ مغنی نامہ ہے نہ ساقی نامہ ہے۔

رباعیات قلمی نسخوں میں سے کسی میں بیس ہیں کسی میں پچیس ہیں۔ ہمارے پرانے نسخے میں ۲۷ ہیں اور بمبئی اور لکھنؤ کے چھپے ہوئے نسخوں میں ۷۵ تک ان کی تعداد پہنچ گئی ہے۔

۱۹۰۴ء میں مطبع نامی لکھنؤ نے دیوان کو اور بھی ملحقات سے بھر دیا۔ اس مطبع میں پہلے جو نسخہ چھپا تھا اس میں ۶۱۲۳ اشعار تھے۔ سید جلال الدین اندرابی نے جو غالباً اس مطبع سے کچھ تعلق رکھتے ہیں ایک شعر کسی کا دیکھا جس میں دیوان حافظ کے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار بتائی گئی ہے۔ اس سے ان کو یہ شوق ہوا کہ آٹھ ہزار اشعار

دیوان کے پورے کرنے چاہئیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے قلمی اور غیر ملکوں کے چھپے ہوئے ۱۰۴ نسخے دیوان حافظ کے جمع کیے اور یہ اصول رکھا کہ کم سے کم چار نسخوں میں جو شعر ملے اس کو لے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس طرح ۶۸ غزلیں، ۹۵ رباعیاں، ایک معما، ۴۵ قطعات، ایک مسدس، ۱۲۴۲۔ اشعار متفرقہ اور بھی شامل کر دیئے۔ آخر میں خود لکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت شعروں اور غزلوں کی نسبت ملحق ہونے کا گمان غالب تھا، لیکن آٹھ ہزار اشعار کی تکمیل کے شوق میں ان کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔

ہم اس شوق اور مذاق کو کیا کہیں جس کی بدولت ایک ایسی قیمتی محنت رائیگاں گئی۔

ہم مولانا سودیؒ کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں کہ انھوں نے حافظؔ کی سچی خدمت کی اور آج سے تین سو برس پہلے ان کے کلام کا قابل اعتبار اور صحیح مجموعہ چھاپ کر شائع کیا۔

کلام کی اشاعت

خواجہ کی کلام چوں کہ مقبول خاص و عام تھا، اس وجہ سے بہت تھوڑے عرصے میں ملکوں ملکوں پھیل گیا، ہزارہا نسخے اس کے لکھے گئے۔

چھاپے کی ایجاد کے بعد سب سے پہلے مولانا سودیؒ نے سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کو چھاپ کر شائع کیا۔ ترکی زبان میں اس کی ایک شرح بھی لکھی، بعد ازاں پھر مختلف ملکوں میں وہ چھپا۔

اس وقت ہمارے سامنے دو فہرستیں موجود ہیں جن میں دیوان حافظ کے طبع اور اشاعت کی مختصر کیفیت لکھی ہوئی ہے۔

ایک برٹش میوزیم کی فارسی کی قلمی کتابوں کی فہرست مرتبہ چارلس ریو، دوسری بانکی پور کے کتب خانے عام کی فارسی اور عربی کی علمی کتابوں کی فہرست مرتبہ مولوی

عبدالمقتدر صاحب، ان کے علاوہ دیوان کے بیسیوں نسخے دنیا کے مختلف حصوں میں چھپے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں، اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے علم کے مطابق دیوان کے طبع اور اشاعت کی کیفیت درج کریں۔ نیز اس کی شرحوں اور حاشیوں کی بھی فہرست لکھیں۔

نام مقام سنہ اشاعت

.... سترہویں صدی کے آغاز میں مولانا سودی کا نسخہ

لندن ۱۷۹۱ء حافظ کے مختصر حالات زندگی بھی دیباچے کے ساتھ ہیں۔

کلکتہ ۱۷۹۱ء، ۱۸۲۶ء مع حاشیہ مولوی فتح علی صاحب ۱۸۵۸ء۔

۱۸۸۱ء مسٹر جیرٹ کا نسخہ

لیپزگ ۱۸۵۴ء براکھاس نے مولانا سودی کا نسخہ مع ان کی شرح طبع کرایا۔

ویانا ۱۸۵۸ء روزنر دیگ نے مع اپنے ترجمے کے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ۱۸۶۳ء مولانا سودی کے نسخے کی نقل

قسطنطنیہ ۱۲۵۷ھ، ۱۸۷۰ء مع دو شرحوں کے ایک مولانا سودی کی دوسری مولانا سید محمد کی۔

تہران ۱۲۵۸ھ

تبریز ۱۲۵۷ھ

اصفہان ۱۲۶۵ھ

مشہد ۱۲۶۴ھ

بمبئی ۱۲۲۸ھ، ۱۸۴۱ء، ۱۲۶۷ھ، ۱۲۲۷ھ

بولاق (مصر) ۱۲۵۰ھ، ۱۲۵۶ھ، ۱۲۸۱ھ

دہلی ۱۲۶۹ھ، ۱۸۸۸ء۔

آگرہ ۱۸۶۱ء

لکھنؤ مطبع نول کشور میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۶ء تک ۹ مرتبہ اور مطبع نامی

میں ۱۹۰۴ء تک چار بار

لاہور ۱۸۸۸ء، ۱۹۰۷ء

کان پور ۱۸۳۱ء، ۱۹۰۳ء

نام کتاب نام مصنف مطبوعہ یا قلمی زبان کیفیت

شرح دیوان حافظ مولانا سودی، مولانا سید محمد ابن سید حسن، مولانا شمعی، مصطفےٰ بیگ مصلح الدین سروری، شیخ محمد افضل الہ آبادی میر سیف الدین ابو الحسن عبدالرحمٰن ختمی، شیخ محمد دہلوی، مولوی سید علی صاحب، شیخ یوسف لاہوری، مولوی صادق علی صاحب مطبوعہ قسطنطنیہ

قلمی کتب خانہ سلطانی

" برٹش میوزیم

" کتب خانہ بانکی پور

مطبوعہ لکھنؤ

قلمی کتب خانہ علی گڑھ کالج

مطبوعہ دہلی

" لکھنؤ

" بمبئی وغیرہ

" لکھنؤ

" کلکتہ

" لاہور

ترکی

ان شرحوں کا پتا فارسی کی دوسری شرحوں سے لگایا لیکن یہ نہ معلوم میں رہیں ۔
ہو سکا کہ کس کتب خانہ میں رہیں ۔

تصف موجود ہے

ان شارحوں سے ہم کو عام شکایت یہ ہے کہ انھوں نے بالکل صوفیانہ مذاق کی شرحیں لکھیں ہیں، ادبی خوبیاں جو خواجہ کے کلام میں ہیں ان کو ظاہر نہیں کیا ہے ۔ یہ صرف خانقاہوں میں پڑھی جانے کے قابل ہیں ۔

صوفیانہ کلام میں جو خوبی ہے وہ اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ مجاز اور حقیقت دونوں پر منطبق ہو ۔ جب اس میں سے ایک پہلو نکال ڈالا جائے تو کوئی خوبی باقی نہیں رہتی ۔ ان شارحوں نے بھی موتی کی آب چھیلنے کی کوشش کی ہے جس سے آب بھی گئی اور موتی بھی خراب ہوا ۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ آسان اور غیر ضروری باتوں کی تفصیل میں تو صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہیں لیکن تاریخی اور ادبی معلومات کا مطلق پتا نہیں ہے جس کے بغیر پڑھنے والے کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔

سترہویں صدی کی ابتدا سے خواجہ کی بعض بعض غزلوں کے ترجمے یورپ کی بھی مختلف زبانوں میں نظم و نثر میں شروع ہوئے اور لوگوں نے ان کے ساتھ دلچسپی لینی شروع کی ۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں ولیم اوسلی اور دان ہیمر وغیرہ نے جرمن اور انگریزی زبانوں میں دیوان کے ترجمے شائع کیے ۔ ولیم جونس نے کئی غزلوں کے مضامین لے کر انگریزی میں گیت بنا دیئے، جن میں سے ''اگر آں ترک شیرازی'' کا گیت نہایت دل فریب اور عام پسند ہوا اور لوگ اس کو گانے لگے ۔ اس وقت سے خواجہ کے ساتھ یورپ میں ایک عام دلچسپی پیدا ہوگئی، تمام یورپین زبانوں میں ان کے دیوان کے ترجمے شائع ہوئے اور لوگوں نے ان کے متعلق کتابیں لکھنی شروع کیں ۔

دیوان کے ترجمے اور وہ تصانیف اور مضامین جو یورپ کی مختلف زبانوں میں خواجہ کے متعلق لکھے گئے ہیں، ان کو کون شمار کر سکتا ہے۔ ذیل میں ہم خواجہ کے کلام کے صرف ان ترجموں کی ایک فہرست لکھتے ہیں جو انگریزی یا بعض دوسری یورپین زبانوں میں ہم کو معلوم ہو سکے۔

نام مترجم کام کی نوعیت مقام اشاعت سنہ اشاعت

میننسکی دیوان کی پہلی غزل کا لاطینی نثر میں ترجمہ ویانا ۱۶۶۰ء

ہائڈ آکسفورڈ ۱۷۶۷ء

ریوسکی ابتدائی سولہ غزلوں کا لاطینی نثر میں ویانا ۱۷۷۱ء

رچرڈسن ''اسپسمین آف پرشین پوئٹری'' پہلی سولہ لندن ۱۷۷۴ء
غزلوں کا انگریزی میں

ولیم جونس پورا دیوان انگریزی نثر میں ۱۷۹۷ء

ولیم اوسلی تین جلدوں میں ۱۷۹۹ء

ولیم جونس ۷۵ غزلیں فرانسیسی نظم میں ۱۷۹۹ء

ہنڈلی ۱۱ غزلیں انگریزی نظم میں ۱۸۰۰ء

وان ہیمر پورا دیوان جرمن نظم میں ۱۸۰۱ء

ڈانز پورا دیوان جرمن نثر میں دو جلدوں میں ہمبرگ ۱۸۴۶ء

نوربزگ ۱۸۵۲ء

روزنزویگ متن دیوان مع ترجمہ ویانا ۱۹۵۸ء
جرمن نثر میں تین جلدوں میں

ینسل مین انتخاب دیوان جرمن نظم میں برلن ۱۸۶۵ء

رابن سن نو غزلیں انگریزی نظم میں لندن ۱۸۷۳ء

بک نل ۱۲۰ غزلیں انگریزی نظم میں ۱۸۷۵ء

کپتان کلارک پورا دیوان انگریزی نثر میں ۱۸۹۱ء

دوجلدوں میں

جان ناٹ ۷ اغز لیں انگریزی نظم میں

اکثر انگریزی ترجمے دیکھنے آئے، ہم نے ان کو پسند کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان سے دوسری زبان میں معمولی مضامین کا ترجمہ کرنا بھی جس کو ترجمہ کہہ سکیں دشوار ہے۔ پھر شاعر کا ترجمہ کرنا کیسے ممکن ہے۔ ترجمہ سے صرف شعر کا مفہوم ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں زبان کی اسلوب بیان کی، الفاظ کی نشست کی جو خوبیاں ہوتی ہیں ان کا ظاہر کرنا محال ہے۔ ہر ایک مترجم نے اس بات کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔

انگریزی کے تمام ترجموں میں ہم کو کپتان کلارک کا ترجمہ زیادہ پسند آیا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ مشکل اشعار کی تشریح بھی کرتے گئے ہیں۔

میڈم لوئسا لکھتی ہے کہ حافظ کے ترجمے میں بہ نسبت فرنچ اور انگلش کے جرمن میں زیادہ کامیابی ہوئی ہے کیوں کہ اس میں اس قسم کے شاعرانہ خیالات ترجمہ کرنے کے لیے بہت سی آسانیاں ہیں۔

خواجہ کے کلام پر ایک نظر

خواجہ کے کلام سے ہماری مراد صرف غزلیات ہیں کیوں کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ غزلوں کے علاوہ اور جو چیزیں مثلاً قصیدے، ترکیب بند، ترجیع بند، مغنی نامہ، ساقی نامہ وغیرہ ہیں ان سب کا صحیح نسخوں میں پتہ نہیں ہے، اس لیے اگر ہم زبردستی سے خواجہ کے سر ان کو منڈھ دیں تو یہ حقیقت اور انصاف دونوں کے خلاف ہوگا۔

قطعات اور رباعیات میں الحاق اس قدر کیا گیا ہے کہ یقیناً کسی قطعہ یا رباعی کو خواہ کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔ اگر چند رباعیاں یا قطعے ان کے مان بھی لیے جائیں تو ان سے ان کی شاعری کے رتبے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اس لیے ہم ان سب کو کالعدم سمجھتے ہیں۔

خواجہ غزل گوئی کے مرد میدان ہیں۔ مرد میدان ہی نہیں بلکہ بادشاہ، اس لیے ہم صرف ان کی غزل پر ایک نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے نفس شاعری کے متعلق بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔

شعر کی تعریف یہ ہے کہ جذبے کا احساس ایسے لفظوں میں ادا کیا جائے جن سے سننے والے کے اسی جذبے کو ویسا ہی ہیجان ہو جیسا خود شاعر کے جذبے کو تھا۔ شاعر کی مثال بعینہ مصور کی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مصور ظاہری اشیا کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر خیالات اور جذبات کی صورت گری کرتا ہے۔

لیکن خیالات محض کی صورت گری کا نام شاعری نہیں ہے جب تک ان میں واقعیت نہ ہو یا کم سے کم واقعیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نہ ہوں۔ کیوں کہ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں یعنی نہ وہ کلام کسی واقعی جذبے کی آواز ہے نہ اس آواز سے مشابہ ہے تو وہ شعر نہیں ہے۔

شاعر کسبی چیز نہیں ہے۔ شاعر اپنی شاعری خدا کے گھر سے لاتا ہے عربی میں مثل ہے۔

''الشعراء تلامیذ الرحمٰن''

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کلمات کو الٹ پھیر کر موزوں کر لینا اور اسی روش کے اشعار کہہ لینا بلکہ اس سے اچھے استعارات اور تشبیہات پیدا کر لینا جو حقیقی شعرا کے کلام میں ہوتے ہیں آسان ہے، ہر شخص تھوڑی سی کوشش سے کر سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے کلام میں جو بظاہر شاعری کے تمام فنون عروض، قافیہ، بدائع و صنائع وغیرہ سے مزین و مرصع ہوتے ہیں اور اصلی شاعری میں وہی فرق ہے جو مصنوعی بھڑکیلے چمکیلے ناواقفوں کی نگاہوں کا دھوکا دینے والے آبگینوں اور اصلی جواہرات میں ہوتا ہے۔

خواجہ حافظؔ نے خود اسی بات کو ایک شعر میں صاف طور پر کہا ہے:

آنرا کہ خوانی استاد گر نبگری بہ تحقیق

صنعت گریست اما شعر رواں نہ دارد

جس کو تم استاد کہتے ہو اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھو تو وہ صنعت گر ہے، فطری شاعر نہیں۔

شاعری تشبیہ، استعارہ، الفاظ کی نزاکت، لفظی رعایت اور صنائع و بدائع کا نام نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں شاعری کی اضافی زیب و زینت ہیں، اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہے۔ شاعری اسی کو کہتے ہیں کہ جذبے کی ایسی تصویر کھینچ جائے کہ الفاظ سے شاعرانہ جذبہ اس طرح صاف نظر آئے جیسے سفید شیشے میں ارغوانی شراب دور سے جھلکتی ہے۔

ارسطوؔ نے وزن کو شاعری کا جزو قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس نے وسیع معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر اپنے جذبات میں خود محو نہ ہو جائے بلکہ ان پر قابو رکھے اور دوسروں کو ان سے متاثر

کرے۔ یہ شاعری کی اعلا قسم ہے اور اس کا نام خطابت (لیکچر یا اسپیچ دینا) رکھا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے جذبے کے جوش میں وجد کرے اور مست ہو جائے۔ اس کا نام شاعری ہے۔ اس میں وزن ضروری ہے۔ کیوں کہ مقفّیٰ اور موزوں ہو جانے سے کلام کی تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔

جذبات کا احساس کس کو نہیں ہوتا اور ہر شخص ان کو ادا کرتا ہے۔ لیکن شاعر کا احساس زیادہ نازک اور لطیف ہوتا ہے اور وہ اس کینڈے سے ادا کرتا ہے جس سے سننے والے پر اثر ڈالتا ہے۔

شاعری کا اصلی راز اسلوب بیان میں مخفی ہے۔ وہی بات ایک شخص کہتا ہے کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ اسی کو جب شاعر کہتا ہے تو طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔

خواجہ فطرتی شاعر ہیں۔ وہ اگر چہ اپنے حقیقی جذبات کو مجازی استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں لیکن جو کچھ کہتے ہیں وہ واردات قلبی ہیں۔ یعنی ''حال'' ہے ''قال نہیں''۔ فرماتے ہیں:

بلبل از فیض گل آموخت سخن ورنہ نبود

ایں ہمہ قول و غزل تعبیہ در منقارش

بلبل نے گل کے عشق میں ترانہ ریزی سیکھی ورنہ یہ زمزمہ اور نغمہ اس کی چونچ میں جڑا ہوا نہ تھا۔

ایک جگہ کہتے ہیں:

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار

عشوۂ فرمائے تا من طبع را موزوں کنم

میں نے بے سمجھے بات کہہ دی۔ جانِ من! معاف کر، ایک عشوہ دکھلا دے کہ میں اپنی طبیعت موزوں کرلوں۔

الغرض خواجہ کے تمام شاعرانہ جذبات فطری ہیں۔ ان کا کلام شاعری کا

بہترین نمونہ ہے۔ جدت، جوش، بلندی، غرض جس قدر خوبیاں کلام میں ہونی چاہئیں۔اس میں بدرجہ کمال موجود ہیں۔ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ چند مثالیں ان کے کلام سے پیش کرتے ہیں۔

جدت شعراء

قلقل مینا کی آواز سن کر یا کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر توبہ توڑتے ہیں۔حافظ کی جدت دیکھئے:

بتے چوں ماہ زانو زد مئے چوں لعل پیش آورد
تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر (۱)

حسین چاند جیسا حسین سامنے انداز سے دوزانو ہو کر شوخی آمیز ادب کے ساتھ بیٹھتیا ہے اور لعل جیسی سرخ شراب پیش کرتا ہے۔اس وقت حسن پرست مے خوار جو ناصحوں کے کہنے سننے سے توبہ کر چکا ہے بے تاب ہو جاتا ہے، خیالات میں کش مکش پیدا ہوتی ہے، کبھی توبہ کا خیال آتا ہے، ناصحوں کی باتیں یاد آتی ہیں، کبھی اس دل فریب اور دل کش منظر کو دیکھ کر خواہش جوش ماتی ہے کہ پی لے۔آخر اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کر کے فیصلہ کرتا ہے۔

تو گوئی تائبم حافظؔ ز ساقی شرم دار آخر

حافظ کو یہ بات کہنی ہے کہ لوگ بے گناہ شراش خواروں کو ستاتے ہیں اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

بیکے جرعہ آزار کش در پے نیست
زحمتے میکشم از مردم ناداں کہ مپرس

ایک چلو کے پیچھے جس سے کسی تکلیف نہیں پہنچتی، بے وقوف آدمی (واعظ) سے ایسی زحمت اٹھانی پڑتی ہے کہ نہ پوچھئے

ایک اردو کے شاعر نے بھی خوب کہا ہے:

واعظ، شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

یہ بات کہ میں تیرا عاشق نہیں ہوں بلکہ سیکڑوں تجھ پر فریفتہ ہیں، اس انداز سے کہتے ہیں:

نہ من بر آں گل عارض غزل سرائم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

صرف میں ہی اس پھول سے رخسار پر غزل سرائی نہیں کرتا ہوں بلکہ چاروں طرف سے ہزاروں بلبلیں اس پر چہک رہی ہیں۔

ان کے تمام شعروں میں جدت ہے۔ معمولی سی بات کو بھی وہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ بے ساختہ وجد کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ خیال کہ واعظ دوسروں کو جس بات سے منع کرتا ہے خواہ اس کو کیوں کرتا ہے ایک معمولی خیال ہے۔ وہ اس کو کس لطیف پیرائے میں کہتے ہیں:

مشکلے دارم ز دانش مند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

مجھے ایک مشکل آن پڑی ہے ذرا محفل کے عالم سے پوچھ دو کہ جو لوگ توبہ کا حکم دیتے ہیں وہ خود توبہ کیوں نہیں کرتے۔

اس میں جدت کے ساتھ بے انتہا شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ ''مشکلے دارم'' سے اس بات کا اظہار ہے کہ ہم نہایت نیک اور سادہ دل ہیں کہ اس قسم کی فریب کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے مشکل میں پڑے ہوئے ہیں اور پھر خود نہیں پوچھتے بلکہ دوسرے سے کہتے ہیں کہ پوچھ دے تا کہ خود تماشا دیکھیں اور اس پر طرہ یہ کہ اسی شخص سے یہ مشکل حل کراتے ہیں جس کے اندر یہ عیب ہے یعنی واعظ سے۔

بلندی:

خواجہ کے اشعار موزل بندوق سے مشابہ ہیں جو دیکھنے میں خوب صورت نظر آتی ہے اور

☆☆☆

ا:نائینی ونذیر احمد اور قزوینی دونوں نسخوں میں یہ شعر نہیں ہے

☆☆☆

انسان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ یہ خوش نما زیور بڑے بڑے شیروں کو ہزار گز دور ہی سے ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ان کے اشعار کی لطافت اور نزاکت کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں زبان ہی کا ذائقہ اور شیرینی ہے لیکن جب معانی کی طرف خیال کیجئے تو بے انتہا بلند ہوتے ہیں۔مثلاً:

شکر ایزد کہ میان من و او صلح افتاد

حوریان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

خدا کا شکر ہے کہ میرے اور اس کے درمیان صلح ہوگئی حوروں نے ناچتے ہوئے شکرانے کے پیالے پئے۔

اپنی اور معشوق کی صلح کو کس قدر اہم کر دیا یعنی گویا اس صلح کا زمین کو آسمان کو یہاں تک کہ حوروں کو بھی انتظار تھا، اگر نہ ہوتی تو خدا جانے کیا انقلاب عظیم ہو جاتا۔ حوریں ہمہ تن منتظر کھڑی دیکھ رہی تھیں اور جب انھوں نے دیکھا کہ ہمارے درمیان میں صلح ہوگئی تو گائیں اور ناچیں اور شکرانے کے ساغر پئے۔

سلاست:

کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سلیس اور آسان ہو۔ مشکل سے مشکل اور باریک سے باریک مضامین مختصر اور عام فہم عبارت میں ادا کر دیئے جائیں۔کلام میں اشکال، گنجلک یا تعقید کا واقع ہونا دراصل اس کے متکلم کی نا قابلیت کی دلیل

ہے۔ جو لوگ مشکل الفاظ اور استعارے استعمال کر کے اپنے کلام کو مغلق بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بلغا اور فصحا کے نزدیک گونگے ہیں کہ اس پردے میں اپنی عیب کو چھپاتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس قسم کے مغلق کلام کو لوگ کہتے ہیں کہ بلیغ ہے۔ حالاں کہ بلاغت سے وہ کوسوں دور ہے۔ کسی کلام کے بلیغ ہونے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سلیس اور عام فہم ہو کیوں کہ بلیغ کلام کی تعریف یہ ہے کہ ''وہ فصیح کلام جو مقتضائے حال کے مطابق ہو'' یعنی اس میں کوئی لفظ نامانوس نہ ہو۔ اس کی ترکیب میں گنجلک اور تعقید نہ واقع ہو اور جس قسم کا موقع ہو اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں تاکہ جذبہ یا مافی الضمیر کا صحیح صحیح اظہار ہو نہ کہ کلام چیستاں بنایا جائے۔

قدما کے کلام میں بالعموم سلاست پائی جاتی ہے۔ سعدیؔ اور حافظؔ نے تو اپنے کلام کو پانی کر کے رکھ دیا ہے۔ حافظؔ نے اعلا سے اعلا خیالات کو اپنے اشعار میں ادا کیا ہے۔ لیکن کہیں اشکال یا اغلاق ان کے کلام میں نہیں ہے، یہ ممکن ہے کہ ان کے اشعار کے مضامین کی بلندی تک آدمی اپنی نا قابلیت سے نہ پہنچ سکے۔ لیکن ان کے الفاظ وہاں تک پہنچانے میں مساعدت کرنے سے کوتاہی نہیں کرتے۔

حافظؔ کے کلام کی یہ عجیب خوبی ہے کہ وہ اس قدر لطیف اور سلیس ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن اس کے معانی کی تہ تک بڑے بڑے اہل کمال بھی مشکل سے پہنچتے ہیں۔

ان کی صوفیانہ غزلیں مثلاً:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

یا یہ غزل:

زاہد خلوت نشیں دوش بہ میخانہ شد

از سر پیماں برفت با سر پیمانہ شد

ہر کس و ناکس کے لیے دل کش ہیں۔ حالاں کہ اس کے حقیقی مفہوم کے چہرے سے پردہ اٹھانے والے بہت کم لوگ ہیں۔

شوخی و ظرافت:

شاعری اور خاص کر غزل گوئی کا بڑا عنصر رندی ہے۔ شاعر آزادی پسند ہوتا ہے اسلیے وہ ان لوگوں سے جو اس کی آزادی اور رندی میں مخل ہوں جلتا ہے۔ ان کو اپنا مخالف اور اپنے مقاصد میں سدراہ سمجھتا ہے اور ان کی برائیاں کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاعر واعظ، محتسب، ناصح، زاہد وغیرہ کا جو اس کو روکتے ہیں اور منع کرتے ہیں دشمن ہو اور ان کے مخفی عیوب کو فاش کرے۔ ان لوگوں کے مخفی عیوب مکاری اور ریاکاری وغیرہ ہیں۔ ظاہری تقوے کی آڑ میں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں اور زاہد کے لباس میں فریب دے کر عوام کو لوٹتے ہیں۔

ریاکار اور مکار ہر زمانے اور ہر قوم میں ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں میں ایسے لوگ پیشتر بہت کم تھے۔ چھٹی صدی سے یہاں بھی یہ جماعت بڑھنے لگی۔ مولانا روم نے ان سے لوگوں کو خبردار کیا۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نباید داد دست

سعدیؔ نے اپنی تصنیفات میں کئی ایسے ریاکار زاہدوں کے قصے بیان کیے ہیں اور غزلوں میں بھی ریاکاری وغیرہ کی قلعی کھولی ہے، مگر حافظؔ نے اس کو انتہا پر پہنچا دیا۔ کہتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ در محراب منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

’آں‘ کے اشارے میں کتنی شوخی ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ کون سا کام بلکہ اشارہ کرتے ہیں کہ ’’وہ کام‘‘ گویا متکلم اور مخاطب اس کام کو پہلے ہی سے جانتے ہیں اور وہ ایسا کام ہے کہ لوگوں کے سامنے اس کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

من ایں مرقع پشمینہ بہر آں دارم
کہ زیر خرقہ کشم مے کس ایں گمان نبرد

میں یہ پیوند لگا ہوا اونی خرقہ اس لیے پہنتا ہوں کہ اس کے نیچے شراب چھپا کر پیوں اور کسی کو گمان بھی نہ ہو۔

ریا کار صوفی صوف کا جبہ پہن کر عوام میں اپنا تقدس ظاہر کرتا ہے اور در پردہ ایسے ایسے گناہ کرتا ہے کہ جس کا لوگ اس پر گمان بھی نہیں کر سکتے، اس کی حالت کو خود اپنی حالت قرار دے کر بیان کرنا نہایت درجے کی ظرافت ہے۔

حافظؔ نے جہاں بھی ان پر چوٹ کی ہے ایسی ظرافت اور شوخی کے ساتھ کی ہے کہ ان شعروں کے حسب حال جو واعظ یا صوفی ہوں وہ بھی اگر سنیں تو ایک دفعہ ان کو مزا آ جائے بخلاف اس کے اردو کا شعر ملاحظہ ہو جو ایک نہایت مشہور شاعر کا ہے:

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

بزرگ، اور وہ بھی خضر بزرگ جوتے نہیں چرایا کرتے۔ اردو شاعر کے نزدیک گویا ہر قسم کے عیوب، واعظوں، بزرگوں اور صوفیوں میں ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اس نے جوتے چرانے تک کا الزام بھی ان پر لگا دیا:

عشق و مستی:

خواجہ کی اصلی شاعری کا خمیر عشق اور سرمستی ہے۔ ان کے اوپر یہ جذبہ اس قدر

غالب ہے کہ جھومنے لگتے ہیں، وجد میں آ کرناچتے ہیں، ہاتھ جھٹکتے ہیں، پانو پٹکتے ہیں، ان کے مستانہ اشعار سنیے:

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد
من و ساقی بدو تازیم و بنیادش بر اندازیم
چو در دست ست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم
یکے از عقل مے لافد یکے طامات مے بافد
بیا کیں داد ریہا را بہ پیش داور اندازیم

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں:

رقص بر شعر ترو نالۂ نے خوش باشد
خاصہ رقصے کہ در آں دست نگارے گیرند

جوش:

خواجہ نے رندی اور مے خواری کے متعلق اس قدر پر جوش اشعار لکھے ہیں کہ تمام فارسی شاعری میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ مثلاً:

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود
سر ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

جب تک شراب خانہ اور شراب کا نام باقی رہے گا اس وقت تک ہمارا سر پیر مغاں کی خاک راہ بنا رہے گا۔

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں:

ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

ایک جگہ کس جوش کے ساتھ کہا ہے:

من ترک عشق شاہد و ساغر نمی کنم
صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

میں عشق بازی اور شراب خواری کو نہ چھوڑوں گا۔ سو بار توبہ کر چکا اب نہ کروں گا۔

دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت ان پر ایسی کھل گئی تھی کہ وہ اس کے جاہ وجلال کو ہیچ سمجھتے تھے اور بادشاہوں کی شوکت وحشمت ان کی نگاہ میں بچوں کا کھیل تھی۔ اس مضمون کو بھی بڑے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

کہ برد نزد شاہان ز من گدا پیامے
کہ بہ کوئے مے فروشاں دو ہزار جم بجامے

بادشاہوں کے پاس یہ میرا پیام کون پہنچائے کہ میفروشوں کی گلی میں دو ہزار جمشید ایک پیالے پر بکتے ہیں۔

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حال اہل دل بشنو
کہ از جمشید و کیخسرو فراواں داستاں دارد

ایک چو خاک پر چھڑک دو اور اہل دل کا حال سنو کہ جمشید اور کیخسرو کے بیشمار قصے بیان کرتی ہے۔

نقشا کھینچنا:

خواجہ کیفیات اور جذبات کا نقشا خوب کھینچتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ طالب علمی کے زمانے میں عبدالغفور نامی ایک کشمیری نوجوان نہایت خوبصورت اور حسین ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ اور

ذہین اور طباع آدمی تھے۔ عربی شعر میں سے ابونواس کی جدت طرازیاں ان کو بہت پسند تھیں اور حافظ کو تو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر خیال کرتے تھے۔ ایک دن کچھ شعروشاعری کا تذکرہ تھا۔ کہنے لگے کہ حافظ اپنے جذبات کی جیسی تصویر کھینچتا ہے ایسی کوئی کیا کھینچے گا۔ دیکھئے کیا خوب کہتا ہے:

سر درس عشق دارد دل دردمند حافظ

کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

حافظ کا دردمند دل عشق ہی کا سبق رٹنا چاہتا ہے، اس کو نہ سیر کا خیال ہے نہ باغ کی خواہش ہے۔

بیدلی کی حالت میں تماشا اور سیر باغ کی خواہش نہ ہونا اور عشق میں محو پڑے رہنا کس قدر فطری امر ہے اور عاشق کے استغراق کی کیسی سچی تصویر ہے۔

معشوق کی شوخی اور خرام ناز کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے:

آں لعل دلکشش بیں واں خندۂ دل آشوب

واں رفتن خوشش بیں واں گام آرمیدہ

اس کے دل کش سرخ لب اور اس کی دل آشوب ہنسی دیکھو وہ خرام ناز اور اس کا آہستہ آہستہ قدم اٹھانا دیکھو

اس شعر میں معشوقانہ تمکنت کا کس خوب صورتی کے ساتھ نقشا کھینچا ہے:

ہزار آنکھیں تیرے چہرے کو دیکھ رہی ہیں اور تو خود ناز سے کسی کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا

میں نے کہا کہ فرزدق نے بھی اسی مضمون کا خوب شعر کہا ہے:

یغضی حیاءً و یغضیٰ من مہابتہٖ

فما یکلم الا حین یتبسم

وہ حیا سے آنکھیں نیچے رکھتے ہیں اور لوگ ان کے رعب سے اور جب وہ

باتیں کرتے ہیں تو مسکراتے ہوئے

کہنے لگے رعب اور چیز ہے اور معشوقانہ ناز اور شے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ کا شعر بہت بلند ہے۔ فرزوق کے شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کے رعب سے لوگ نگاہیں نیچی کیے ہوئے ہیں اور حافظ کا معشوق اس قدر دل کش ہے کہ نگاہ اس سے ہٹ ہی نہیں سکتی۔ پھر اسی شعر کو پڑھ کر جھومنے لگے، میں نے کہا کہ حافظ نے بہت سچ کہا ہے:

بشعر حافظ شیراز می رقصند و می نازند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی (۱)

حافظ شیراز کے شعروں پر ناچتے ہیں اور ناز کرتے ہیں کشمیر کے کالی آنکھوں والے اور سمرقند کے ترک۔

چوں کہ وہ بھی "سہ چشمان کشمیری" میں داخل تھے اس لیے جھینپے۔ اس وقت تو یوں ہی بات کو ٹال دیا مگر دوسرے دن اس کا بدلہ لیا۔ بات یہ ہوئی کہ میرے یہاں کوئی تقریب تھی اور میرے دوست کو مٹھائی بہت پسند تھی، میں نے ان کو مٹھائی بھیجی آپ نے رسید میں یہ شعر لکھ بھیجا:

شکر فروش کہ عمرش دراز بادچرا
تفقدے نکند طوطی شکر خارا (۲)

صنائع وبدائع:

یہ ایک مرض ہے جو شعرا کو اکثر لاحق ہو جاتا ہے اور اس سے ان کی نفس شاعری بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے شعراء مثلاً خسرو اور سلمان ساوجی بھی اس کو نہیں نبا سکے ہیں اور اس کی بدولت ان کی شاعری میں نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔ خواجہ کے یہاں بھی صنائع وبدائع بہت کثرت سے ہیں، لیکن ان کی شاعری کا زیور بن گئے ہیں، مثلاً:

گدائے کوئی تو از ہشت خلد مستغنیست
اسیر(۳) بند تو از ہر دو عالم آزاد ست

اس میں صنعت تضاد ہے۔گداو مستغنی، اسیر آزاد، متضاد الفاظ ہیں۔

☆☆☆

ا: قزوینی کے یہاں یہ شعر اسی طرح ہے لیکن نائینی اور نذیر احمد کے نسخے میں یہ شعر یوں ہے:

بخوبال دل مده حافظ ببیں ایں بی وفاییہا
کہ با خوارز میاں کردند ترکان سمرقندی

۲: یہ شعر نائینی اور نذیر احمد کے نسخے میں نہیں ہے۔
۳: قزوینی میں 'بند' کے بجائے 'عشق' ہے۔

☆☆☆

احرام چہ بندیم کہ آں قبلہ نہ اینجاست
در سعی چہ کوشیم کہ از مروہ صفا رفت

اس میں صنعت مراعات النظیر ہے۔احرام، قبلہ،سعی، صفاومروہ سب الفاظ ایک ہی چیز یعنی حج کے متعلق ہیں اور سعی جو ایک رکن کا نام ہے،اس کے لفظی معنی بھی کوشش کے ہیں۔صفاومروہ ان دو پہاڑیوں کا نام ہے۔جن پر سعی ہوتی ہے اور صفا کے معنی پاکیزگی کے بھی ہیں جو یہاں پر مراد لیے گئے ہیں۔غور سے دیکھئے تو اس شعر میں کئی صنعتیں ہیں۔

علاوہ بر ایں لفظی صنائع تجنیس وغیرہ بھی ان کے کلام میں بہت ہیں۔

عربیت:

حافظ کے دیوان میں کئی سو اشعار خالص عربی کے ہیں جو انہیں کے کہے ہوئے ہیں اور جن سے ان کی کمال عربی دانی کا ثبوت ملتا ہے۔قرآن کی آیتوں کو اس خوب صورتی سے شعر میں داخل کر دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زیور پر ہیرا جڑ دیا گیا

ہے۔ مثلاً:

به حسن عارض و قدّ تو برده اند پناه

بهشت و طوبےٰ و طوبےٰ لهسم و حسن مآب

تیرے رخسار اور قد کے حسن میں بہشت وطوبیٰ نے پناہ لی جو خوش خبری ہو ان کو ان کا ٹھکانہ بہت اچھا ہے۔

طوبیٰ لھم وحسن مآب آیت ہے اور کسی موقع سے اس کو لائے ہیں!!

اس شعر میں دوسرے مصرعے میں قرآن کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔

شب وصل است و طے شد نامۂ ہجر

سلام'' فیہ حتیٰ مطلع الفجر

وصل کی رات ہے اور ہجر کا زمانہ گزر گیا، صبح کے نکلنے تک امن ہے

کہیں حدیث اور ضرب المثل لاتے ہیں مثلاً

بصورت بلبل و قمری اگر نہ نوشی مے

علاج کے کنمت آخر الدواء لکے

بلبل اور قمری کی آواز پر اگر تم شراب نہ پیو گے تو میں داغ کر تمہارا علاج کروں گا آخر علاج داغنا ہی ہے۔

'' آخرالدواء لکی'' صحیح حدیث ہے۔

ہر چند کا از موزم ازوے نبود سودم

من جرب المجرب حلت به الندمة

جس قدر بھی میں نے آزمایا مجھے اس سے نفع نہیں ہوا، جو شخص آزمائی ہوئی چیز کو آزماتا ہے پشیمان ہو جاتا ہے۔

دوسرا پورا مصرعہ ضرب المثل ہے۔

خواجہ کی پہلی غزل کے اس مصرعہ پر

متے ما تلق من تھویٰ دع الدنیا و اھملہا

مولانا آزاد بلگرامی اعتراض کرتے ہیں کہ جب شرط کی جزا، امر، نہی یا جملہ اسمیہ ہوتو عربی قاعدے کے مطابق اس پر ف کالانا ضروری ہے یعنی ''فدع'' ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس پر دست اصلاح بھی صاف کیا ہے اور اس طرح بنایا ہے۔

دع الدنیا متے ما تلق من تھویٰ و اھملہا

کیوں کہ جزا کے مقدم کرنے سے ف کالانا ضروری نہیں رہتا۔

ہم اس پر اچھی طرح بحث کرتے مگر حافظ کی روح کہے گی کہ ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد''۔ اصلیت یہ ہے کہ بہت سی ایسی باتیں جو دوسروں کے لیے جائز نہیں ہوتی ہیں شعراء کے لیے جائز ہوتی ہیں۔ رضی وغیرہ نے مذکورہ بالا قاعدے کے ذیل میں شعرائے کے لیے اس کو مباح کیا ہے اور ایسی مثالیں خود عربی شعراء کے اشعار سے پیش کی ہیں۔

پاکیزگی:

خواجہ کے دو صدی پیشتر سے فارسی شعراء کو ہزلیات اور فحش ہجویات کہنے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہاں تک یہ بات عام ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے اہل کمال اس کے مرتکب ہوتے تھے اور ان کے دامن کمال پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا تھا۔ ابو العلائی گنجوی، حکیم انوری، حکیم سوزنی، یہاں تک کہ حکیم سنائی بھی اس سے نہیں بچ سکے۔

سب تو سب شیخ سعدیؒ جیسا اخلاق کا معلم اور دنیا کا ناصح بھی اپنا جبہ و دستار پھینک کر اس دریا میں بے خوف کود پڑا اور وہ وہ کرشمے دکھائے کہ اللہ کی پناہ۔

مگر ایک خواجہ ہیں جن کا کلام ان لغویات سے بالکل پاک ہے جو ان کے کمال

متانت اور سنجیدگی کی دلیل ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کلام میں کوئی مکروہ اور کثیف لفظ تک نہیں آیا۔ فیضی اپنے کلام کی پاکیزگی کا دعوا کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بداں مے ماند ایں پاکیزہ گفتار
کہ در دیوان حافظؔ نام سگ نیست

شیخ محمد یحیٰ لکھتے ہیں کہ غالباً فیضی کی نظر سے خواجہ کا یہ شعر نہیں گزرا۔

شنیدہ ام کہ سگانرا قلادہ مے بندی
چرا بگردن حافظؔ نمے نہی رسنے

مگر ہمارے پاس دیوان کے جس قدر نسخے ہیں ان میں سے صرف ایک نسخے میں یہ شعر ہم کو ملا ورنہ ہر ایک میں مقطع اس طرح پر ہے۔

مزاج تبہ شد دریں بلا حافظؔ
کجاست فکر حکیمے ورای برہمنے

وہ مقطع دراصل امیر خسروؔ کا ہے۔

تصوف

انسان اپنی انتہائی علمی کوشش سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کو عالم موجودات کی حقیقت نہیں معلوم ہوسکتی۔ بڑے بڑے فلسفیوں نے آخر میں مجبور ہو کر یہی کہا کہ:

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

خواجہ نے بھی اسی مضمون کو جابجا بیان فرمایا ہے:

برو اے زاہد خود بیں کہ ز چشم من و تو
راز ایں پردہ نہان ست نہادن خواہد بود

چل اے زاہد خود بیں کہ میری اور تیری دونوں کی نگاہوں سے اس پردے کا راز پوشیدہ ہے اور پوشیدہ رہے گا۔

دوسرا شعر ہے:

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود
گر تو سر گشتہ شوی دائرہ امکان را(۱)

وجود کے اسرار کی ایک رمز سے بھی تو واقف نہیں ہو سکتا چاہے تمام عالم کا چکر لگا آئے

خود اپنی ہی خبر نہیں کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟
خواجہ کہتے ہیں:

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم؟ کجا بودم؟
دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم

معلوم نہ ہوا کہ میں کیوں آیا؟ اور کہاں تھا؟ افسوس ہے کہ اپنے ہی معاملے سے بے خبر ہوں۔
دوسری جگہ کہا ہے:

وجود ما معمایست حافظؔ
کہ تحقیقش فسونست و فسانہ

اے حافظ ہمارا وجود بھی ایک معما ہے جس کی حقیقت کا دریافت کرنا کوشش بے سود ہے۔
ایک غزل میں فرماتے ہیں:

در اندرون من خستہ دل ندانم کیست
کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست

مجھے معلوم نہیں کہ مجھ خستہ دل کے اندر کون ہے کہ میں تو خاموش ہوں لیکن وہ شور مچائے رکھتا ہے۔
اصلیت یہ ہے کہ عالم موجودات کی حقیقت اور اس کے اسرار کا علم انسان کی

عقل کی دسترس سے بالاتر ہے لیکن اگر کچھ اس کا پتا چل تو صرف تصوف سے۔ اس لیے کہ ریاضت روحانی اور مجاہدہ باطنی سے دل کا آئینہ صاف ہو جاتا ہے اور اس میں اسرار کائنات کا عکس خود بخود جلوہ نما ہونے لگتا ہے۔ فلسفہ یا اور کسی کتابی علم سے اس کی تحصیل ممکن نہیں ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں:

بشو اوراق اگر ہم درس مائی
کہ علم عشق در دفتر نہ باشد

اگر تم ہمارے ہم سبق ہونا چاہتے ہو تو کتابوں کو دھو ڈالو، کیوں کہ تصوف کا علم کتابوں میں نہیں ہوتا۔

گو ذوقی اور وجدانی سہی، لیکن علم و معرفت کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ دنیا کے اکثر بڑے بڑے لوگ اسی شاہراہ پر چلے ہیں اور انھوں نے یقین کیا ہے کہ انسان کے اندر ایک باطنی شعبہ ایسا موجود ہے کہ اس کو ریاضت روحانی سے ترقی دے کر وہ معرفت کے اسرار تک پہنچ سکتا ہے۔ خواجہ کہتے ہیں:

ہر کہ شد محرم دل در حرم یار بماند
و آنکہ ایں کار ندانست در انکار بماند

جو شخص اپنے دل کا راز داں ہو گیا وہ یار کے کوچہ میں پہنچ گیا، اور جو اس سے واقف نہ ہوا وہ انکار ہی کرتا رہا۔

اگر ایک شخص ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو کر عالم مخاطب کرے۔ بلند آسمانوں سے، چمکتے ہوئے ستاروں سے، اونچے ہمالہ سے، لمبی چوڑی زمین سے، گہرے اور وسیع سمندر سے دریافت کرے کہ تم کیا ہو؟ تمہاری ہستی اور حقیقت کیا ہے؟ تو اسے کوئی جواب نہیں ملے گا، لیکن اگر وہ آنکھیں بند کر کے خود اپنے ہی دل میں غور کرے تو اسی میں کچھ بند سوتے ایسے ملیں گے جن سے علم حقیقی کا آب حیات حاصل ہو سکتا ہے اور وہ کچھ گرہیں ایسی پائے گا جن کے کھولنے سے اصلیت کا سراغ لگ

سکتا ہے۔ بس صوفی کا یہ کام ہے کہ ان سوتوں کو نکالے اور راوران دل کی بندھی ہوئی گرہوں کو کھولے۔ خواجہ فرماتے ہیں:

گرہ ز دل بکشاد و ز سپہر یاد مکن
کہ فکر ہیچ مہندس چنیں گرہ نکشاد

اپنے دل کی گرہ کھولو اور آسمان کا ذکر نہ چھیڑو کیوں کہ کسی مہندس کی فکر اس گرہ کو نہیں کھول سکی ہے۔

☆☆☆

ا: یہ شعر نہ تو نائینی و نذیر احمد کے نسخوں میں ہے اور نہ قزوینی کے۔

☆☆☆

اور یہ دل کی گرہیں کس طرح پر کھل سکتی ہیں! صرف عشق کے ناخن سے۔ خواجہ فرماتے ہیں:

دلم خزانہ اسرار ود و دست قضا
ورش بہ بست و کلیدش بدلستانے داد

میرا دل اسرار کا خزانہ ہے لیکن خدا نے اس پر قفل لگا کر اس کی کنجی ایک معشوق کے حوالے کر دی ہے۔

اس معشوق کا ملنا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ اگر انسان ہمت کرے اور توفیق اس کی رہبر ہو تو اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خواجہ نے کہا ہے:

جمال یار ندارد نقاب و پردہ ولے
غبار رہ بنشاں تا نظر توانی کرد

حسن یار بالکل بے نقاب اور بے پردہ ہے، راستے سے غبار صاف کر دو نظر آنے لگے گا!

ایک دوسری غزل میں کہا ہے:

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

عاشق اور معشوق میں کوئی شے حائل نہیں ہے۔ حافظؔ اپنا پردہ آپ بنا ہوا ہے درمیان سے اٹھ جا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غبار راہ سے کیا مراد ہے۔ یعنی ''خودی'' اگر انسان خودی کو ترک کر دے تو جمال یار بے حجاب اس کو نظر آنے لگے۔

خودی کیا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

موجودات عالم میں انسان کی طرح نہ عقل ایجاد ہے نہ تمدن ہے۔ اس لیے انسان سب سے برتر ہے اور تمام عالم کا بادشاہ ہے۔

لیکن اہل دل کے نزدیک انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے وجوہ یہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں یعنی عقل ایجاد اور تمدن انسان کے انھیں جذبات کے خدمت گزار ہیں جو جماداتی یا نباتاتی یا حیوانی ہیں۔ فرض کرو کہ بادشاہ نے ایک عالی شان محل بنایا ہر قسم کے آرائشی ساز و سامان اور زریں آلات و فروش سے آراستہ کیا۔ طرح طرح کے نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے۔ قسم قسم کے پھول لگائے۔ بجلی کے چراغ روشن کیے اور شان و شوکت کے ساتھ اس میں جلوس فرمایا۔ اور فقیر آسمان کی چھت کے نیچے ویران بیابان میں فرش خاک پر بیٹھا تو اس سے بادشاہ کی انسانیت میں کیا اضافہ ہوا اور فقیر کی انسانیت میں کیا کمی آئی؟ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ بادشاہ کے حیوانی جذبات عیش پسندی، خود بینی اور غرور و ناز میں اور زیادتی ہو گئی۔ اب اگر اس سے یہ اضافی کر و فر اور ساز و سامان چھین لیا جائے تو اس کی روح کو قلق ہو گا وہ غریب تو اور کانٹوں میں الجھ گیا اور فقیر پھر بھی آزاد رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت کا درجہ ان چیزوں سے بلند ہے۔ اس کی ابتدا دراصل عشق حقیقی سے شروع ہوتی ہے۔ خواجہ کہتے ہیں:

بر در میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گوئے
کاندر آنجا طینت آدم مخمر می کنند

اے فرشتے! عشق کے میخانہ کے دروازے پر بیٹھ کر تسبیح پڑھ، کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آدم کا خمیر تیار کیا جاتا ہے۔

ہر قسم کے طبعی جذبات اور تمام مادی کثافتیں جو دنیا کی کسی چیز میں ممکن ہیں۔ سب انسان کے اندر موجود ہیں۔ اور علم، عقل، جماعت کا اثر اور سلطنت کا قانون کوئی چیز بھی ان کثافتوں سے اس کو پاک نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر کوئی چیز اسے پاک کرنے کے لیے ہے تو صرف عشق ہے۔ یہی وہ بھٹی ہے جس میں جل کر انسان خالص کندن ہو جاتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کو تو کیا فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں:

جلوۂ کرد رخت دید ملک عشق نداشت
عین آتش شد ازیں غیرت و بر آدم زد

تیرے چہرے نے جلوہ دکھلایا، دیکھا کہ فرشتے میں عشق نہیں ہے، اس غیرت سے آگ کا شعلہ بن کر آدم میں لگ گیا

لیکن عشق کی منزل سخت کڑی منزل ہے۔ اس میں وہ تمام جذبات اور خواہشیں جو انسان کے اندر موجود ہیں قربان کر دینی پڑتی ہیں اور مادی ہستی کے چمن کو آگ لگا دینا پڑتا ہے۔ تب انسان انسان ہوتا ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں:

حریم عشق را در گہ بسے بالا تر از عقل ست
کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد

حریم عشق کی درگاہ عقل سے بہت زیادہ بلندی پر ہے۔ وہی شخص اس کی آستاں بوسی کر سکتا ہے جو جان ہتھیلی پر رکھ لے

اسی مادی ہستی کا نام ہے ''خودی''۔

جب تک انسان اس خودی سے قدم باہر نہ نکالے گا۔ اس وقت تک وہ معرفت سے بے بہرہ رہے گا۔ خواجہ کہتے ہیں:

تو کز سرائے طبیعت نمی روی بیروں

کجا بکوئے ریاضت گذر توانی کرد

تو اپنی طبعی جذبات کے دائرے سے تو باہر نکلتا ہی نہیں، پھر بھلا حقیقت کے کوچہ میں تیرا گزر کیوں کر ہو

خواجہ کے اشعار میں جا بجا اس بات کی تحریک پائی جاتی ہے۔ کہ لوگ کیوں مادی جذبات کی خدمت میں مصروف ہیں اور روحانی ترقی اور معرفت کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبےٰ زن

حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

پر کھول اور طوبےٰ کے درخت پر جا کر چہچہا۔ افسوس ہے کہ تجھ جیسی چڑیا پنجرے میں قید رہے

خواجہ کا تمام دیوان شروع سے آخر تک اسی قسم کے روحانی لطائف اور حقیقی اسرار سے لبریز ہے۔ جو لوگ تصوف کے کوچے سے باخبر اور معرفت کے راز سے واقف ہیں وہی کچھ ان لطائف و اسرار کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جو الفاظ اور عبارت سے ذہن نشین کرائی جاسکیں:

شعر حافظؔ ہمہ بیت الغزل معرفت است

آفریں بر نفس دلکش و لطف سخنش

اخلاق

دنیا میں اگر سب سے بہتر کوئی شے ہے تو وہ محبت ہے۔ یہ ایک ایسی تلوار ہے جس سے ان تمام برائیوں کی جو انسان میں موجود ہیں گردن کاٹی جا سکتی ہے۔ اگر

کسی شخص کے اندر فطرتاً محبت کا مادہ موجود ہے تو یقیناً اس کے تمام اخلاق پسندیدہ ہوں گے۔ بزرگوں کی اخلاقی خوبیوں کی جڑ یہی محبت ہے۔

خواجہ کے کلام سے بھی محبت کا شیرہ چھن چھن کے ٹپکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کسی سے رنجیدہ ہونے ہی کا نام کفر ہے:

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم
کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن

ہم وفا کرتے ہیں، ملامت سنتے ہیں اور خوش رہتے ہیں، کیوں کہ ہمارے مذہب میں کسی سے رنجیدہ ہونا کفر ہے

یہ وہی صوفیانہ اور مقدس تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کہ اگر کوئی دائیں گال پر طمانچہ مارے تو بایاں بھی آگے کردو۔ چادر چھینے تو کرتا بھی اتار کردے دو۔ افسوس ہے کہ تمام دنیا صوفی اور فلسفی نہیں ورنہ یہ وہ تعلیم ہے کہ اس کی بدولت چمن دنیا سے باہمی عداوت کی بیخ وبن اکھاڑ کے پھینکی جا سکتی ہے۔

کس جوش کے ساتھ فرماتے ہیں:

چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را
غبار خاطرے از رہ گذار ما نرسد

اسی طرح زندگی بسر کرو کہ اگر تم کسی کے راستے کی خاک بھی بن جاؤ، تب بھی تمہارے غبار سے کسی کا دل مکدّر نہ ہونے پائے

ایک اور جگہ کہا ہے:

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

کسی کو ستانے کے پیچھے مت پڑو اور جو کچھ چاہو کرو، کیوں کہ ہمارے مذہب میں بجز اس کے اور کوئی گناہ نہیں ہے۔

دوستی کی ترغیت دلاتے ہیں:

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل ببا آرد

نہال دشمنی بر کن کہ رنج بے شمار آرد

دوستی کا درخت لگاؤ کہ دل کی مراد کا پھل دے۔ اور دشمنی کا پودا اکھاڑ ڈالو کیوں کہ اس سے بیشمار تکلفیں پہنچتی ہیں

صلح اور نرمی سے دونوں جہاں کے مقصد حاصل ہوتے ہیں۔

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرفست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

دنیا کی نعمت اور دولت سب فانی ہیں۔ ہی اس قابل نہیں کہ ان کے واسطے انسان لڑے جھگڑے اور انسانی شرافت پر دھبہ لگائے۔

نزاع بر سر دنیائے دوں نباید کرد

بآشتی ببرائے نور دیدہ گوئے فلاح [1]

ذلیل دنیا کے لیے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ جان من! صلح رکھو اور اسی سے کامیابی کی بازی جیت لو

عیب گیری ایک ایسا عیب ہے کہ اس سے انسان کے صاف دل پر بہت جلد زنگ بیٹھ جاتا ہے اور یہ عیب خود بینی اور خود رائی، تحقیر غرض بہت سے عیبوں کا تخم انسان کے اندر بو دیتا ہے اور انسان محبت کو کھو دیتا ہے۔ خواجہ کہتے ہیں:

☆☆☆☆

[1]: یہ شعر نائینی و نذیر احمد اور قزوینی کے نسخوں میں نہیں ہیں۔

☆☆☆☆

عیب درویش و تونگر بہ کم و بیش بدست

کار بد مصلحت آنست کہ مطلق نہ کنیم

امیر غریب کسی کی عیب گیری کم ہو یا زیادہ، بری ہے اور مصلحت یہ ہے کہ برا کام ہم مطلق نہ کریں

خواجہ دو رنگی سے بہت جلتے ہیں:

رنگ تزویر پیش ما نبود
شیر سرخیم وافعی سیہیم

مکاری کا رنگ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم جو شیر ہیں تو سرخ اور سانپ ہیں تو سیاہ بھورا شیر اور مٹیالا سانپ دور سے نہیں پہچانا جاتا۔

اسی وجہ سے ریا کاروں سے ان کو سخت نفرت ہے اور انھوں نے نہایت زوردار الفاظ میں ان کی جا بجا مذمت کی ہے:

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش دلے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

ریا حلال شناسند و جام بادہ حرام
زہے شریعت و مذہب زہے طریقت و کیش ا ے

بادہ نوشی کہ در وردی دریائی نہ بود
بہتر از زہد فروشی کہ در وردی و ریاست

بزیر دلق ملمع کمندہا دارند
دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمۂ شبہ میخورد
پار دمش دراز باد آں حیوان خوش علف

اخلاقی معلموں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے، لیکن فرق جو ہوتا ہے وہ کیفیت ادا میں ہوتا ہے، ایک شخص ایک بات بتاتا ہے کچھ اثر نہیں ہوتا، دوسرا اس انداز سے کہتا ہے کہ روح اس کو شہد کی طرح چاٹنے لگتی ہے، مثلاً نیکی اور احسان کو سب اچھا کہتے

ہیں۔خواجہ اسی عام مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

بریں رواق ز برجد نوشتہ اند بزر

کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

آسمان کے اس سبز ایوان پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہے کہ بجز اہل کرم کی نیکی کے اور کوئی چیز باقی نہ رہے گی

اسی طرح کی بتہ سے اخلاقی تعلیم انھوں نے نہایت دلپذیر طریقے سے دی ہے۔مثلاً خودی غرضی چھوڑ دینے سے آدمی کامیاب اور مقبول ہوتا ہے:

طریق کام بخشی چیست ترک کام خود گفتن

کلاہ سروری آن ست کزیں ترک بردوزی

غرور سے انسان ناکام رہتا ہے اور خاکساری سے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے:

زاہد غرور داشت، سلامت نہ برد راہ

رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

فرض ادا کرتے رہو اور مذہبی بحث سے کنارہ کشی کرو:

فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نہ کنیم

وانچہ گویند روانیست نگوئیم رواست

☆☆☆

ا:یہ شعر نائینی وندیر احمد اور قزوینی کے نسخوں میں نہیں ملا۔

☆☆☆

زندگی کو غنیمت سمجھو اور جو سلوک ہو سکے کر ڈالو:

چو بر روی زمیں باشی توانائی غنیمت داں

کہ دوراں ناتوانیہا بسے زیر زمیں دارد

جب دل پاک نہ ہو تو دیر و کعبہ برابر ہے:

چوں طہارت نہ بود کعبہ و بت خانہ یکے است

نبود خیر در آں خانہ کہ عصمت نہ بود

بے ادب بزرگوں کے فیض سے محروم رہتا ہے:

حافظؔا علم و ادب ورز کہ در مجلس شاہ

ہر کرا نیست ادب لایق صحبت نہ بود

بجز اللہ کے اور کسی کے آگے حاجت پیش کرنا ذلت ہے:

حافظؔ آب رخ خود بر در ہر سفلہ مریز

حاجت آں بہ کہ بر قاضی حاجات بریم

یورپ کے بعض ظاہر پرست مصنفوں نے جو روحانیت سے بالکل ذوق آشنا نہیں ہیں، خواجہ کے رندانہ اور مستانہ اشعار کو دیکھ کر یہ لکھا ہے کہ ان کا فلسفۂ اخلاق وہی ہے جو اپیکورس کا تھا لیکن یہ ان کی سخت نافہمی ہے۔ خواجہ معرفت کو شراب، ارباب ذوق کو ساقی، وجد کو مستی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی اصطلاحیں ان کے کلام میں آتی ہیں۔ جن کو ایشیا کے سخن فہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کی رندی و سرمستی اس قسم کی نہیں ہے جیسی اپیکورس کی تھی اور جو سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھی۔ ان کا جام شاعری مدرسہ خرمیہ کے زہر ہلاہل سے بالکل پاک ہے۔ ان کی خوش قسمتی حقیقی خوشی ہے۔ اب اس موقع پر صاف کہنا پڑا کہ دراصل ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ رسولؐ پاک کی تعریف میں ہے۔ انھوں نے ہر چند اس کو کنایتاً بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض بعض جگہ صاف نمایاں ہوگئی ہے۔ مثلاً:

بدل ربائی اگر خود سر آمدی چہ عجب

کہ نور حسن تو بود از اساس آدم پیش اے

ملک در سجدۂ آدم زمین بوس تو نیت کرد
که در حسن تو چیزے یافت بیش از طور انسانی

توئی آں گوہر پاکیزہ کہ عالم قدس
ذکر خیر تو بود حاصل تسبیح ملک

گشتیم جہانرا کہ بہینیم و ندیدیم
مثل تو کسے را کہ بود سیرِ قبائل [۲]

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

☆☆☆☆

۱: یہ شعر نامیؔ ونذیر احمد اور قزوینی کے نسخوں میں نہ مل سکا۔
۲: ایضاً۔

☆☆☆☆

کہیں کہیں وہ پیک (پیغمبر) کے لفظ سے کنایہ کرتے ہیں، مثلاً:

آں پیک نامور کہ رسید از دیار دوست
آ درد حرز جاں ز خط مشکبار دوست

خوش میدہد نشان جلال و جمال یار
خوش میکند حکایت عز و وقار دوست

الغرض خواجہ کا کلام روحانی وجد و ذوق اور حقیقی جذبات و لطائف کا مجموعہ ہے جس پر مجازی رندی اور عاشقی کا غلاف پڑا ہوا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

دوستاں در پردہ میگویم سخن
گفتہ خواہد شد بدستاں نیز ہم

حافظ اور سعدی

یہ ٹھیک نہیں معلوم کہ فارسی شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی لیکن یہ امر مسلم ہے کہ فارسی کا سب سے پہلا شاعر جس کا دیوان مل سکا ہے، حافظ ابوالحسن رودکی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں گزرا ہے۔

اگرچہ اس زمانے میں شاعری کی ابتدا تھی اور زیادہ تر لوگ قصیدے لکھتے تھے جن میں امراء اور سلاطین کی مدح ہوتی تھی لیکن شاعری اور حسن و عشق کچھ لازم و ملزوم سی چیزیں ہیں چنانچہ عاشقانہ شاعری یعنی غزل کی بھی ابتدا اسی زمانے سے ہوئی۔

اگرچہ اس وقت جو دیوان رودکی کا موجود ہے، اس میں غزلیں نہیں ہیں لیکن وہ رودکی نے جو غزلیں لکھی تھیں اور اچھی لکھی تھیں۔ مگر ضائع ہو گئیں۔ عنصری کہتا ہے:

غزل رودکی وار نیکو بود

غزلہائے من رودکی وار نیست

اس موقع پر ہم اس کے قصائد کی تشبیب سے چند عشقیہ اشعار نقل کرتے ہیں جن سے کچھ اس کی غزلوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے گا

رودکی

تا دل من در ہوائے نیکواں گشت آشنا

در سرشک دیدہ گردانم چو مرد آشنا

آں گلے بشگفت کاں بر خوبرویاں سر بود

و ز بنفشہ بر سر سرد سہیش افسر بود

شخص با جاں آں زماں باشد کہ با جاناں بود

مرد با دل آنزماں باشد کہ با دلبر بود

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس

آسماں بر ربائی دل و آسماں ببری جاں

رودکی کے دوسو برس بعد تک بجز اس کے کہ زبان اور اسلوب بیان میں کسی قدر صفائی اور شستگی ہوگئی غزل میں کوئی نمایاں ترقی نہ ہوئی۔ انوری، خاقانی اور ظہیر وغیرہ نے قصیدہ گوئی کو معراج کمال پر پہنچا دیا، زبان کو صاف کیا، لیکن مداحی نے ان کو غزل گوئی کی طرف توجہ کرنے کی بہت کم فرصت دی۔

چھٹی صدی کے آخر کا وہ زمانہ تھا جس میں شاعری کا تیسرا اور آخری پیغمبر پیدا ہوا یعنی سعدی۔ یہ شخص ایک عجیب دماغ خدا کے یہاں سے لایا تھا جس کے اندر مختلف طاقتیں اور نہایت زبردست طاقتیں مجتمع تھیں۔

وہ زاہدوں میں سچا زاہد، رندوں میں مست رند، منبروں پر فصیح و بلیغ خطیب اور محفلوں میں لطیف و ظریف شاعر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں آئینہ شریعت تھا اور دوسرے ہاتھ میں سندان عشق۔ وہ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے:

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اس کے جدت پسند دماغ نے غزل گوئی کی اسی پرانی لکیر کو جس میں عشق مجازی کی کیفیت ہوتی تھی پیٹنا پسند نہ کیا۔ اس نے ایک نئی شاہراہ نکالی جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک تھی، یعنی اس نے مجاز اور حقیقت دونوں کو باہم منطبق کر دیا اور ظاہری عشق میں تصوف اور درویشی کا نمک ملا دیا جس سے اس کے دیوان کا نام نمکدان قرار پایا۔

وہ معشوق مجازی کے رخساروں کے آئینوں میں شاہد حقیقی کی جھلک دکھاتا ہے اور زلف و خال اور لب و دنداں سے اس کے ازلی صفات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ عارفین اور کاملین کو رندوں اور میخواروں کے بھیس میں جلوہ گر کرتا ہے اور دف و چنگ کے پردے میں غیبی واردات اور صوفیانہ رموز کے نغمے گاتا ہے۔

اس کا یہ رنگ دنیا کو اس قدر پسند آیا اور اتنا مقبول ہوا کہ بلا استثنا تمام شعرا نے اسی کی پیروی شروع کی۔امیر خسروؔ[1]، امیر حسن دہلوی، خواجو کرمانی کمال خجندی اور سلمان ساؤجی وغیرہ۔الغرض جس قدر شعراء شیخ کے بعد ہوئے سب نے اسی کی شاہراہ اختیار کی اور اسی کے قدم بقدم چلنا شروع کیا۔امیر خسروؔ کہتے ہیں:

خسروؔ سرمست اندر ساغر معنی بریخت

شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

لیکن جو رنگ شیخ نے ایجاد کیا تھا اس میں کوئی اس کی برابری نہ کرسکا تھا گو اس کے پیروؤں میں امیر خسرو سب سے آگے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ کے کلام کو ان کا کلام نہیں پہنچ سکتا۔امیر خسروؔ کے اشعار میں سادگی، دل آویزی اور گرمی سب باتیں سہی لیکن نہ اس قدر جتنی کہ شیخ کے کلام میں ہیں۔

☆☆☆☆

۱: امیر خسروؔ دہلوی مشہور شاعر ہیں (متوفی ۷۲۵ھ) امیر حسن دہلوی بھی، امیر خسروؔ کے دوست تھے، انھوں نے ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔کمال خجندی ایک صوفی شاعر تھے۔تبریز میں سکونت اختیار کر لی تھی۔۸۰۳ھ میں وفات پائی۔

☆☆☆

شیخ کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد خواجہ حافظؔ کی شاعری کا زمانہ آیا جنھوں نے اس کے لگائے ہوئے چمن کو ایسا آراستہ و پیراستہ کیا کہ وہ جنت کا نمونہ بن گیا اور اس کے پودوں کی شاخوں کو آسمان تک پہنچا دیا۔

ہمارے سامنے اس وقت ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے تمام بڑے بڑے شعراء کے دیوان رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہم ان کو پڑھتے ہیں اور پھر خواجہ کے دیوان کو اٹھا کر دیکھتے ہیں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔حقیقت میں کپتان کلارک کا یہ کہنا نہایت صحیح ہے کہ ’’خواجہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کا موازنہ دنیا کے کسی شاعر کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا‘‘۔

امیر خسرؔو، خواجہ سلمان، کمال خجندیؔ، ان لوگوں کا کمال اسی وقت تک نظر آتا ہے جب تک کہ خواجہ حافؔظ کے مقابلے میں نہ لائے جائیں، خواجہ کے کلام کو ان لوگوں کے کلام کے ساتھ موازانہ کرنا دراصل خواجہ کی ہتک اور تحقیر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم دوسرے شعرا کے کلام کو اچھا نہیں سمجھتے اور ان پر عیب گری کرتے ہیں:

ما عیب کس برندی و مستی نمی کنیم

لعل بتاں خوشست و مے خوشگوار ہم

لیکن یہ ایک واقعہ ہے جس کے بیان کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ چاند کی روشنی نہایت دلفریب ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ سورج نہ ہو۔

سلمان ساوجی اور کمال خجندی خواجہ کے بے حد قائل تھے اور دونوں اپنی اچھی اچھی غزلوں کو خواجہ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ کمال خجندی نے ایک مرتبہ یہ غزل جو ان کو بہت پسند تھی خواجہ کے پاس بھیجی۔

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بچشم

واں گہے دزدیدہ در ما سینگر گفتم بچشم

گفت اگر سر در بیاباں غمم خواہی نہاد

تشنگاں را مژدۂ از ما ببر گفتم بچشم

گفت اگر یابی نشان پائے ما بر خاک راہ

بر نشاں آنجا بدامنہا گہر گفتم بچشم

گفت اگر گردد لبت خشلک از دم سوزان ما

باز میسازش چوں شمع از دیدہ تر گفتم بچشم

گفت اگر داری خیال در وصل ما کمال

قعر ایں دریا بہ پیما سر بسر گفتم بچشم

خواجہ نے اس مصرعہ "تشنگاں رامژدۂ از ما بر گفتم بچشم" کو بہت پسند فرمایا اور تعریف کی۔اب ذرا خواجہ کا دیوان اٹھا کر دیکھئے بہت تلاش کرنے سے شاید اس میں کوئی ایسی غزل مل سکے گی جو اس سے اونچے درجے کی نہ ہو۔

الغرض اصلی غزل کی ایجاد شیخ نے کی اور اس کی تکمیل خواجہ پر ہوگئی۔شیخ کا قول ہے:خواجہ بھی شیخ کی استادی کو تسلیم کرتے ہیں:

استاد غزل سعدی ست نزد ہو کس اما

دارد سخن حافظؔ طرز سخن خواجو

خواجہ نے ابتدا میں خواجوؔ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔اس موقع پر اسی کی شکر گزاری کرتے ہیں ورنہ آج خواجوؔ کو کون جانتا ہے۔

الغرض سعدیؔ کے بعد غزل گوئی میں اگر کوئی پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ حافظؔ ہے اور حافظؔ کی غزلوں کے مقابلے میں اگر کسی کی غزلیں لائی جا سکتی ہیں تو سعدیؔ کی۔

فارسی غزل گوئی کے یہی دونوں بڑے رکن ہیں۔ایک موجد ہے دوسرا اس کو درجہ کمال پر پہنچانے والا ہے۔اہلی شیرازی کہتا ہے

عقل و فہم شاعراں در عجز و حیرت آورند

سعدیؔ معجز بیان و حافظؔ سحر آفریں

اگر چہ ہم اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک شاعر کی شعر گوئی کی اصلی کیفیت اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کا دیوان مطالعہ کیا جائے۔مگر اس موقع پر سعدیؔ اور حافظؔ کے بعض ہم مضمون اشعار اس لیے پیش کرتے ہیں تا کہ کچھ کچھ ان کے اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکے۔

حافظؔ نے کہیں تو سعدیؔ کے بعض مصرعے بجنسہ لے لیے ہیں اور ان پر اپنا مصرع لگا کر شعر کو قطرہ سے موتی بنا دیا ہے اور کہیں دونوں کے اشعار کا مضمون مل گیا ہے۔

سعدیؔ:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
سگم خواندی و خوشنودم جزاک اللہ کرم کردی

حافظؔ:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ سیزیبد لب لعل شکر خارا

شیخ کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات تھی، خواجہ نے پہلا مصرعہ بجنسہ لے لیا اوراس پر اپنا دوسرا مصرع لگا کر شعر کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔

سعدیؔ:

جز ایں قدر نتواں گفت بر جمال تو عیب
کہ مہربانی از آں طبع و خونمے آید

حافظؔ:

جز ایں قدر نتواں گفت بر جمال تو عیب
کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

شیخ نے یار کے جمال میں یہ عیب نکالا کہ اس کی طبیعت میں مہربانی نہیں ہے لیکن جمال سے حسن ظاہری مراد ہے اور طبیعت کی مہربانی ایک باطنی چیز ہے۔ خواجہ نے اس نکتے کو محسوس کرلیا اور اس باطنی صنعت کو بھی انھوں نے ظاہری شکل میں لا کر یوں کہا کہ اس خوب صورت چہرے پر مہر و وفا کا تل نہیں ہے۔

سعدیؔ:

اے کہ پندم دہی از عشق و سلامت گوئی
تو نبودی کہ سن ایں جام محبت خوردم

حافظ:

منعم کنی ز عشق وی اے مفتی زماں
معذور دارمت کہ تو او را ندیدہ

شیخ کہتا ہے کہ عشق سے مجھے روکنا اور ملامت کرنا فضول ہے کیوں کہ جام عشق میں نے ازل ہی میں پیا ہے اور مشیت ازلی یہی تھی۔ خواجہ کہتے ہیں کہ اے مفتی زمانہ تو جو مجھے عشق سے منع کرتا ہے تو میں تجھے معذور سمجھتا ہوں کیوں کہ تو نے اس حسن کو دیکھا ہی نہیں۔ یہ مضمون انسانی فطرت کے مطابق اور دل نشیں ہے۔

سعدی:

من از کجا و تمنائے وصل تو ز کجا
اگرچہ آب حیاتی ہلاک خود جستم [1]

حافظ:

تو از کجا و امید وصال او ز کجا
بدامنش نرسد دست ہر گدا حافظ

☆☆☆

[1]: یہ شعر نائینی و نذیر احمد اور قزوینی کے نسخوں میں نہیں ہے

☆☆☆

شیخ کہتا ہے کہ میں تیرے وصل کی کیوں کر تمنا کر سکتا ہوں تو اگر چہ آب حیات ہے لیکن میرے لیے مہلک ہے۔ دونوں مصرعوں کا جوڑ کچھ ٹھیک ملا نہیں۔ بخلاف اس کے خواجہ کہتے ہیں کہ حافظ تو کہاں اور اس کے وصل کی امید کہاں تو ایک فقیر ہے اور وہ بادشاہ ہے۔ ہر فقیر کا ہاتھ اس کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔

سعدی:

آن نہ خال ست و زنخدان و سر زلف پریشان
کہ دل اہل نظر برد کہ سریست خدائی

حافظؔ:

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد
کہ نام آن نہ لب و لعل و حظ زنگاریست

مضمون دونوں ایک ہی بیان کرنا چاہتے ہیں کہ معشوق کے زلف و لب اور خال و خط پر اہل نظر عاشق نہیں ہوتے بلکہ ان کو ان میں کسی اور چیز کی جھلک نظر آ جاتی ہے، جس پر وہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر دونوں کا طرز بیان الگ الگ ہے۔ سعدیؔ نے صاف صاف اس کو کہہ دیا کہ "سریست خدائی"۔ حافظ نے کنایہ میں کہا کہ "لطفیہ ایست نہانی" وہی بات ہے مگر حافظؔ نے اس کو زیادہ لطیف پیرایہ میں کہا۔

سعدیؔ:

یارب تو آشنا را مہلت دہ و سلامت
چندانکہ باز بیند دیدار آشنا را

حافظؔ:

کشتی شکستگانیم اے باد شرط برخیز
باشد کہ باز بینیم دیدار آشنا را

مہلت اور سلامتی مانگنے کے لیے قید مصیبت کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا۔ خواجہ نے ظاہر کیا کہ ہم کشتی شکستہ ہیں۔

خواجہ نے اپنے اس شعر کا مضمون دراصل خواجہ عبید اللہ انصاریؒ متوفی ۴۸۱ھ کے اس شعر سے لیا ہے۔

کشتی شکستہ جسمت کز روح باز ماندہ
تا نفخ صور جوید آمرزش خدارا

مگر یہ مضمون محض صوفیانہ تھا، خواجہ نے اس کو اپنے رنگ کا بنالیا۔

انسان کے آخری فیصلے کی کیفیت کو جب کہ وہ طے کرلیتا ہے کہ یا جان دے دوں گا یا مقصد حاصل کروں گا، نظامیؔ نے اپنے بہادرانہ لہجے میں اس طرح ادا کیا ہے:

من آں گہ عناں باز پیچم ز راہ
کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ

میں راستے سے اس وقت اپنی لگام پھیروں گا کہ یا سر دے دوں یا تاج لے لوں

سعدیؔ نے عاشقانہ انداز میں یوں کہا:

تا چہ خواہد کرد با من دور گیتی زیں دو کار
دست او در گردنم یا خون من بر گردنش

دیکھا چاہیے کہ زمانے کی گردش ان دونوں کاموں میں سے کون سا کام میرے ساتھ کرتی ہے، اس کے ہاتھ میری گردن میں پڑتے ہیں یا میرا خون اس کی گردن پر

حافظؔ کہتے ہیں:

او بخونم تشنہ و من بر لبش تا چوں شود
کام بستانم ازو یا داد بستاند ز من

وہ میرے خون کا پیاسا ہے اور میں اس کے لبوں کا، دیکھا چاہیے کہ کیا ہوتا ہے، میں اس سے اپنا مطلب حاصل کرتا ہوں یا وہ مجھے قتل کرتا ہے۔

سعدیؔ کے شعر میں یہ کمی تھی کہ انھوں نے پہلے مصرع میں اپنی طلب اور کوشش کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی۔ حافظؔ نے ایک حد تک اس کمی کو پورا کیا، لیکن اب تک ان میں سے کسی میں یہ خوبی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ ضرب المثل بنتا۔ خواجہ نے

دوسرے شعر میں اسی مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا:

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

اب ہر طرح یہ مضمون مکمل ہو گیا۔ اور مذاق عام کی روح میں حلول کر جانے کی قابلیت اس میں پیدا ہو گئی چنانچہ یہ ضرب المثل ہو گیا۔ الغرض سعدیؔ اور حافظؔ کے طرز ادا میں بے انتہا فرق ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

سعدیؔ:

عمر ہا در پئے مقصود بجاں گردیدیم

دوست در خانہ و ما گرد جہاں گردیدیم

حافظؔ:

سالہا دل طلب جام جم از ما میکرد

وانچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا میکرد

☆☆☆

سعدیؔ:

کجا خود شکر ایں نعمت گذارم

کہ زور مردم آزاری ندارم

حافظؔ:

من از بازوے خود دارم بسے شکر

کہ زور مردم آزاری ندارم

☆☆☆

سعدیؔ:

همه از دست غیر ناله کنند

سعدیؔ از دست خویشتن فریاد

حافظؔ:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

کہ با من آنچہ کرد، آں شنا کرد

☆☆☆

سعدیؔ:

مردہ از خاک لحد رقص کناں برخیزد

گر تو بالائے عظامش گزری دھی رمیم

حافظؔ:

بر سر تربت من با مئے و مطرب بنشیں

تا بہ بویت ز لحد رقص کناں برخیزم

☆☆☆

سعدیؔ:

بخدا کہ گر بمیرم کہ دل از تو بر نگیرم

بروائے طبیب از سر کہ دوا نمی پذیرم

حافظؔ:

بروائے طبیب از سر کہ خیال سر ندارم

بخدا رہا کنم جاں کہ ز جاں خبر ندارم اے

☆☆☆

سعدیؔ:

کنار سعدیؔ ازاں روز کز تو دور افتاد

ز آب دیدہ تو گوئی کہ کنار جیحونست

حافظؔ:

ازاں زماں کہ ز چنگم برفت رود عزیز

کنار و دامن من ہمچو رو و جیحونست

☆☆☆

سعدیؔ:

عرقت بر ورق روے نگاریں بچہ ماند؟

ہمچوں بر خرمن گل قطرۂ باران بہاری

حافظؔ:

از تاب آتش مے بر گرد عارضش خوے

چوں قطرہائے شبنم بر برگ گل چکیدہ

☆☆☆

سعدیؔ:

بیحاصلست یارا، اوقات زندگانی

الّا دمیکہ یارے با ہمدمے بر آرد

حافظؔ:

اوقات خوش آن بود کہ با دوست بسر برد

باقی ہمہ بیحاصلی و بے خبری بود

☆☆☆

☆☆☆☆

ا: یہ شعر ہمارے پیش نظر دونوں نسخوں میں نہ مل سکا۔

☆☆☆☆

سعدیؔ:

اگرچه خاطرت باهر کسے پیوند ہا دارد
سباد آنروز و آں خاطر که سن با تو جز پیوندم

حافظؔ:

اگر بر جائے سن غیرے گزنید دوست حاکم اوست
حرامم باد اگر سن جاں بجاے دوست بگزنیم

☆☆☆

سعدیؔ:

بنده ام گر بلطف سیخوانی
حاکمی گر بقهر سیرانی

حافظؔ:

اگر بلطف بخوانی سزید الطافت
دگر بقهر برانی درون سا صافست ا ے

☆☆☆

سعدیؔ:

عروس ملك نكو روے دختر یست ولے
وفا نمی کند ایں سست سهر با داماد

حافظؔ:

مجو درستی عهد از جهاں سست نهاد
که ایں عجوزه عروس هزار داماد ست

☆☆☆

سعدیؔ:

به تماشائے درخت چمنش حاجت نیست
هر کہ در خانہ چنو سرور دانے دارد

حافظؔ:

مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش
فراغ از سرو بستانی و شمشاد چمن دارم

☆☆☆

سعدیؔ:

ما ز ورطۂ ما خبر ندارد
آسودہ کہ بر کنار دریاست

حافظؔ:

شب تاریک و بیم موج و گردابے بے چنین حائل
کجا دانند حال ما سبکباران ساحلہا

☆☆☆

سعدیؔ:

نہ من خام طمع عشق تو میورزم و بس
کہ چو من سوختہ در خیل تو بسیارے ہست

حافظؔ:

نہ من بر آں گل عارض غزل سرائم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارنند

☆☆☆

سعدیؔ فارسی زبان کا پیغمبر ہے۔ اسلوب بیان کا بادشاہ ہے۔ اس کی گلستاںؔ کی نظر کے ایک ایک فقرے دوسرے شعراء کے ایک ایک دیوان پر بھاری ہیں۔ لیکن

دیکھیے معنوی خوبیوں میں، لفظوں کی شیرینی اور فصاحت میں، طرز ادا اور اسلوب بیان کی جدت اور لطافت میں حافظ کس قدر اس سے بلند ہے۔

مولانا حالی کہتے ہیں:

''جن اصولوں پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اس کے بعد اکثر متغزلین نے وہی اصول اختیار کئے کیوں کہ ان کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران ترکستان اور ہندستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے بڑھ گئی۔ از انجملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص حافظ شیراز کی غزل نے اپنا وہ سکہ

☆☆☆

یہ شعر ہمارے پیش نظر دونوں نسخوں میں نہ مل سکا۔

☆☆☆

جمایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے، یا فقر درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے، یا راگ راگنی سے آشنا تھے، یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے، یا عاشق مزاج اور عشق دوست تھے، سب جان و دل سے اس پر قربان ہو گئے، رقص و سرود کی محفلوں میں، حال و قال کی مجلسوں میں، قہوہ خانوں میں، شعراء کی صحبتوں میں، مشائخ کے حلقوں میں، در و دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔

کلام کا نمونہ

فارسی کی تمام شاعری کا اگر انتخاب کیا جائے تو اچھے اور عمدہ اشعار اتنے نہ نکل سکیں گے جتنے صرف دیوان حافظ میں نکلیں گے۔ دیوان حافظ کے تمام اشعار شروع سے سے آخر تک (سوائے الحاقی غزلوں کے) بے مثل اور لاجواب ہیں:

انچہ ابیات بلندست کہ از طبعش زاد

انتخابیست ز دیوان سخن بخش ازل

ولیم جونس کہتا ہے کہ

حافظؔ کا دیوان اس چمن سے مشابہ ہے جس میں انسان اگر ایک پھول کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو دوسرے پھول کا رنگ اور تازگی دیکھ کو اس کو توڑنے کو جی چاہتا ہے، اور جب اس کی طرف لپکتا ہے تو تیسرے کی شگفتگی اور خوب صورتی سفارش کرتی ہے کہ مجھ کو توڑو، گلچیں متحیر اور مبہوت رہ جاتا ہے کہ کس کو توڑے اور کس کو نہ توڑے۔

یہ ممکن ہے کہ اپنی طبیعت کے مذاق کے مطابق کسی کو ایک غزل دوسری سے زیادہ پسند آئے، لیکن بحیثیت نفس شاعری کے دیوان حافظؔ کا انتخاب نہیں ہوسکتا، بہت سے لوگوں نے انتخابات کیے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ایک نے جو غزلیں چھوڑ دی ہیں دوسرے نے وہی منتخب کی ہیں۔ صائب کہتا ہے:

کہ شعر حافظؔ شیراز انتخاب ندارد

ہم کو اس انتخاب پر ایک واقعی یاد آیا۔ کئی سال کا عرصہ ہوا، ایک دفعہ ہم قنوج سے گزرے۔ دل نے کہا اکثر یہاں سے عطر منگواتے ہیں، کارخانے والے جیسا چاہتے ہیں اٹھا کر بھیج دیتے ہیں اب تو یہاں آ ہی گئے ہیں، لاؤ ایک دن کے لیے ٹھہر جائیں اور خود کارخانے میں چل کر اپنی پسند کے موافق دوستوں کے لیے عطر کی شیشیاں خریدیں۔ ٹھہر گئے۔ شام کے وقت ایک بڑے کارخانے میں پہنچے۔ وہاں جانے کے ساتھ ہی اس قدر خوشبو دماغ میں بس گئی کہ اچھا اور برا پہچاننا تو درکنار کیوڑے اور گلاب میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ آخر کارخانے والوں نے جو شیشی اٹھا کر دے دی وہی لے لی۔

دیوان حافظؔ دیکھتے وقت بھی قوت انتخاب دماغ سے بالکل جاتی رہتی ہے۔

تمام تذکرہ نویس اس سے انتخاب کرنے کو بے ادبی سمجھتے ہیں۔ ہم اس موقع پر بلا انتخاب چند غزلیں جو ہمارے ملک کے لوگوں میں عام طور پر مشہور ہیں، درج کرتے ہیں:

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود و ز راہ و رسم منزلہا
مرا در منزل جاناں چہ امن عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا
شب تاریک و بیم موج و گردابے چنین ہائل
کجا بنداند حال ما سبکباران ساحلہا
ببوئے ناقہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید
ز تاب جعد مشکینش چہ خون افتاد در دلہا
ہمہ کارم ز خود کامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا
حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظؔ
متیٰ ما تلق من تہوی وع الدنیا و اہلہا
دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
دہ روزہ مہر گردوں افسانہ است و افسوں
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا
کشتی شکستگانیم اے باد شرط برخیز

باشد کہ باز بینم دیدار آشنا را

در حلقہ گل و مل خوش خواند دوش بلبل

ھات الصبوح ھبوا یا ایھا السکارا

اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت

روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند

گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

آئینہ سکندر جام جمست و بنگر

تا بر تر عرضہ دارد احوال ملک دارا

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی

کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا

گر مطرب حریفاں ایں پارسی بخواند

در رقص و حالت آرد پیران پارسا را

حافظؔ بخود نپوشید ایں خرقہ مے آلود

اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلا را

فغان کیں لولیان شوخ و شیریں کار شہر آشوب

چنان بردند صبر از دل که ترکاں خوان یغما را

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است

بآب درنگ و خالو حظ چه حاجت روئے زیبا را

من از آں حسن روز افزوں که یوسف داشت

دانستم

که عشق اس پرده عصمت برون آرد زلیخار را

حدیث از مطرب دمے گو دراز دہر کمتر جو

که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

نصیحت گوش کن جانا که از جاں دوست تر

دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

بدم گفتی و خرسندم عفاك الله نکو گفتی

جواب تلخ سیزیبد لب لعل شکر خارا

غزل گفتی و در سفتی بیاد خوش بخواں حافظ

بر نظم تو افشاند فلك عقد ثریا را

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را

که سر بکوه و بیاباں تو دادۂ ما را

شکر فروش که عمرش دراز باد چرا

تفقدے نکند طوطے شکر خارا

غرور حسن اجازت مگر نه داد اے گل

که پرسشے بکنی عندلیب شیدا را

بخلق و لطف تواں کرد صید اہل نظر

به بند دام نگیرند مرغ دانا را
چو با حبیب نشینی و باده پیمائی
بیاد آر محبان باد پیما را
نه دانم از چه سبب رنگ آشنائی نیست
سهی قدان سیه چشم ماه سیما را
جز ایں قدر نتوان گفت در جمال تو عیب
که بے خال مهر و وفا نیست روے زیبا را
در آسمان نه عجب گرز گفتهٔ حافظؔ
سماع زهره برقص آورد مسیحا را
رسید مژده که ایام غم نخواهد ماند
چنان نماند و چنیں نیز هم نخواند ماند
من از چه در نظر یار خاکسار شدم
رقیب نیز چنیں محترم نخواهد ماند
غنیمتے شمر اے شمع وصل پروانه
که ایں معامله تا صبحدم نخواهد ماند
سروش عالم غیبم بشارتے خوش داد
که بر در کرمش کس وژم نخواند ماند
سرود مجلس جمشید گفته اند ایں بود
که جام باده بیاور که جم نخواند ماند
بریں رواق زبر جد نوشته اندر بزر
که جز نکوئی اهل کرم نخواهد ماند
چه جائے شکر و شکایت ز نقش نیك و بدست

چو بر صحیفۂ ہستی رقم نخواہد ماند

ز مہربانی جاناں طمع مبر حافظؔ

کہ نقش جور و نشان ستم نخواہد ماند

غلام نرگس مست تو تاجدارانند

خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز

وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بیں

کہ از تطاول زلفت چہ سوگوارانند

رقیب درگذر و بیش ازیں مکن نخوت

کہ ساکنان در و دست خاکسارانند

نصیب است بہشت اے خدا شناس برو

کہ مستحق کرامت گنہگارانند

نہ من براں گل رارض غزل سرایم و بس

کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من

پیادہ میروم و ہمرہاں سوارانند

بیا بمیکدہ و چہرہ ارغوانی کن

مرد بصومعہ کانجا سیاہ کارانند

☆☆☆

ا: نائینی ونذیر احمد: صنع، قزوینی: وضع، خال، بہرحال، یہاں زیادہ مناسب ہے۔

☆☆☆

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
که بستگان کمند تو رستگارانند

نه هر که چهره بر افروخت دلبری داند
نه هر که آئینه سازد سکندری داند

نه هر که طرف کله کج نهاد و تند نشست
کلاه داری و آئین سروری داند

هزار نکته باریک تر ز مو اینجاست
نه هر که سر بتراشد قلندری داند

در آب دیدهٔ خود غرقه ام چه چاره کنم
که در محیط نه هر کس شناوری داند

بباختم دل دیوانهٔ و ندانستم
که آدمی بچهٔ شیوهٔ پری داند

وفائے عهد نکو باشد ار بیاموزی
وگرنه هر که تو بینی ستم گری داند

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
که دوست خود روش بنده پروری داند

ز شعر دلکش حافظ کسے بود آگاه
که لطف طبع و سخن گفتن دری داند

واعظاں کیں جلوه در محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبه فرمایاں چرا خود توبه کمتر می کنند

گوئیا باور نمیدارند و ز داوری
کیں ہمہ قلب و دغل در کار داور میکنند

بندۂ پیر خراباتم کہ درویشان او
گنج را از بے نیازی خاك بر سر میکنند

اے گدائے خانقہ برجہ کہ در دیر مغاں
مے دہند آبے و دلہا را توانگر میکنند

حسن بے پایان او چندانکہ عاشق میکشد
زمرۂ دیگر بعشق از غیب سر بر میکنند

خانہ خالی کن دلا تا منزل جاناں شود
کیں ہوسناکاں دل و جاں جائے دیگر میکنند

بر در میخانۂ عشق اے ملك تسبیح گوئے
کاندر آنجا طینت آدم مخمر میکنند

صبحدم از عرش مے آمد خروشے عقل گفت
قدسیاں گوئی کہ شعر حافظؔ از بر میکنند

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں مخور

اے دل غم دیدہ حالت بہ شود دل بد مکن
ویں سر شوریدہ باز آید بساماں غم مخور

دور گردوں گردد روزے بر مراد ما نگشت
وا گما یکساں نباشد حال دوراں غم مخور

ہاں مشو نومید چوں واقف نہ از سرّ غیب
باشد اندر پردہ سازی ہائے پنہاں غم مخور

ہر کہ سرگرداں بعالم گشت و غم خوار نیافت
آخر الاسراد بغمخوارے رسد ہاں غم مخور

در بیاباں گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

گرچہ منزل بس خطرناکست و مقصد بس بعید
ہیچ راہے نیست کورانیست پایاں غم مخور

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

مطرب خوشنوا بگو تازہ بتازہ نو بنو
بادۂ دلکشا بجو تازہ بتازہ نو بنو

با صنمے چوں لعبتے خوش بنشیں بخلوتے
بوسہ ستاں بکام ازو تازہ بتازہ نو بنو

ساقی سیم ساق من نیست سیم بیار پیش
زود کہ پر کنم سبو تازہ بتازہ نو بنو

بر ز حیات کے خوری گر نہ مدام میخوری
بادہ بخور بیا داد تازہ بتازہ نو بنو

شاہد دلربائے من میکند از برائے من
نقش و نگار درنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو

با صبا چو بگذری بر سر کوئے آں پری
قصہ حافظش بگو تازہ بتازہ نو بنو

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولٰے
دیں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولٰے

چوں عمر تبہ کردم چندانکہ نگہ کردم

در کنج خراباتے افتاد خراب اولےٰ

چوں مصلحت اندیشی دور است ز درویشی

ہم سینہ پر از آتش ہم دیدہ پر آب اولےٰ

از ہمچو تو دلدارے دل بر نہ کنم آرے

چوں تاب کشم بارے زاں زلف تباب اولےٰ

من حالت زاہد را با خلق نخواہم گفت

کیں قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولےٰ

تا بے سر و پا باشد اوضاع فلک زیں دست

در سر ہوس ساقی در دست شراب اولےٰ

چوں پیر شدی حافظؔ از میکدہ بیروں آئی

رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولےٰ

☆

خواجہ کے کلام کی مقبولیت

حسد چہ میبری اے سست نظم بر حافظؔ

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست

خواجہ کی غزلیں جس ذوق شوق کے ساتھ جنوبی ہند میں گائی جاتی ہیں اسی جوش وخروش کے ساتھ ترکستان کے میدانوں میں ان کا راگ گونجتا ہے، اور جس طرح دریائے گنگا کے کناروں پر اس کے نغمے اٹھتے ہیں اسی طرح دریائے ڈنیوب کی موجوں سے اس کے راگ ٹکراتے ہیں۔

گو خواجہ کو گزرے ہوئے آج پانچ سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن ان کی غزلیں اب تک ویسی ہی دل کش اور دلفریب ہیں جیسی پہلے تھیں اور اتنی صدیاں گزرنے پر بھی ان کی مقبولیت کی نوجوانی پر کسی قسم کا بڑھاپا نہیں چھایا، کیوں کہ ان کی بنیاد فطرتی جذبات پر ہے۔ یعنی ان جذبات پر جو ہر قوم، ہر ملک اور ہر طبقے کے آدمیوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کی ہر دل عزیزی میں اس وقت تک فرق نہیں آسکتا۔ جب تک کہ انسان کی فطرت نہ بدل جائے۔

خاص فارس میں میں تو اس کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بادشاہوں اور امرا کے درباروں، فقراء اور درویشوں کے جمگھٹوں، عوام الناس اور بازاریوں کی محفلوں، غرض ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں وہ یکساں مقبول ہیں۔ بچے بچے کو سیکڑوں شعر ازبر ہوتے ہیں، عورتیں غزلیں کی غزلیں یاد رکھتی ہیں اور گاتی ہیں۔ میڈم لوئیسا لکھتی ہیں کہ فارسی کی ایک کتاب ''کلثوم ننہ'' ہے جس میں وہاں کی مستورات کے مذاقیہ من گھڑت رسم و رواج کے مسئلے لکھے ہوئے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔

''ہر ایک عورت کے لیے لازم ہے کہ طنبور بجانا سیکھے تاکہ اس کے ذریعے سے طبیعت کی افسردگی اور کلفت کو دور کر سکے، اور اس پر حافظؔ کی غزلیں گائے، اگر ایسا

اتفاق ہو کہ طنبورہ کسی گھر میں نہ ہو تو سینی یا لکڑی کے کسی تختے کو بجائے اور گائے۔ اگر یہ بھی نہیں ہے تو اپنے ہاتھ کہیں نہیں گئے، تالیاں ہی سہی!''

☆☆☆

ا: ہم یہ کتاب بڑی جستجو سے حاصل کی۔ چھوٹا سا رسالہ ہے۔ شروع سے آخر تک بار بار پڑھا۔ یہ ہدایت اس کتاب میں ضرور ہے لیکن حافظ کی غزل کا ذکر کہیں بھی ہم کو اس کتاب میں نہیں ملا مگر اس میں شبہ نہیں کہ فارس کی عورتیں حافظ کی غزلیں گاتی ہیں۔

☆☆☆

ہم کو تواریخ میں بعض ایسے آدمیوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کو خواجہ کا پورا دیوان حفظ تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ موالی لاری جو علامہ دوانی کے شاگرد تھے، خواجہ حافظ کا پورا دیوان ازبر رکھتے تھے۔

خواجہ نے سچ کہا ہے۔

حافظؔ حدیث عشق تو از بسکہ دل کش است
نشنید کس کہ از سر رغبت زبر نکرد

مگر

قدر زر زر گر بداند قدر جوہر جوہری

سب سے زیادہ خواجہ کے کلام کی قدر جس نے کی وہ فارس کے شعرا کا گروہ ہے۔ انھوں اس کے راستے میں خلوص اور عقیدت مندی کا فرش بچھایا، اس پر مدح و ثنا کے پھول برسائے، اعزاز و احترام کے صدر پر اس کو بٹھایا اور اس کی پرستش شروع کی۔ ان کی سیکڑوں غزلوں پر تضمینیں کیں۔ انھیں کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی اور انھیں کے قدم بہ قدم چلنا شروع کیا۔ بابا فغانیؔ، صائبؔ، نظیریؔ، عرفیؔ اور تمام شعراء جو خواجہ کے بعد ہوئے ان کے دواوین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نے اپنے پیش نظر خواجہ ہی کو رکھا ہے اور انھیں کا تتبع کرنا چاہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بقول خواجہ کے:

حدیث مدعیان و خیال ہم کاراں

ہماں حکایت زرد وزد بوریا بافست

زمین وآسمان کا فرق ہے۔

خواجہ کے کلام کی مقبولیت کا ایک ادنا نمونہ یہ ہے کہ ہندستان میں جہاں فارسی زبان بولی نہیں جاتی۔ سیکڑوں شعر ان کے بطور ضرب المثل استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہم اس موقع پر وہ اشعار درج کرتے ہیں جو بہت مشہور ہیں اور اردو لکھنے بولنے میں عام طور پر لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں:

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست

با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست

بآب ورنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

راز درونِ پردہ ز رندان مست پرس

کیں حال نیست زاہد عالی مقام را

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن

کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نه جان من خطا اینجاست
دور مجنون گذشت و نوبت ماست

هر کسے پنج روز نوبت اوست
پری نهفته رخ و دیو در کرشمهٔ حسن

بسوخت دیده ز حیرت که این چه بوالعجبی ست
مصلحت نیست که از پرده برون افتد راز

ورنه در مجلس رندان خبرے نیست که نیست
هر چه هست از قامت ناساز و بے اندام ست

ورنه تشریف تو بر بالائے کس کوتاه نیست
رواق منظر چشم من آشیانهٔ تست

کرم نما و فرود آ که خانه خانهٔ تست
مجو درستی عهد از جهان سست نهاد

که این عجوزه عروس هزار داماد ست
من از بیگانگاں هرگز نه نالم

که با من آنچه کرد آں آشنا کرد
شاهد آں نیست که موئے و میانے دارد

بندهٔ طلعت آں باش که آنے دارد
کس ندانست که منزل گه عشاق کجاست

ایں قدر هست که بانگ جرسے می آید
واعظاں کیں جلوه در محراب و منبر می کنند

چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند
صد ملک دل بی نیم نظر میتواں خرید

خوبان درین معامله تقصیر می کنند

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید

دیگران هم بکنند آنچه مسیحا می کرد

عیب می جمله چو گفتی هنرش نیز بگو

نفی حکمت مکن از بهر دل عامی چند

نخواهد این چمن از سرو و لاله خالی ماند

یکی همی رود و دیگری همی آید

سر خدا که عارف سالک بکس نگفت

در حیرتم که باده فروش از کجا شنید

حافظ وظیفهٔ تو دعا گفتن است و بس

در بند آن مباش که نشنید یا شنید

آنانکه خاک را به نظر کیمیا کنند

آیا بود که گوشهٔ چشمی بما کنند

برین رواق زبرجد نوشته اند بزر

که جز نکوئی اهل کرم نخواهد ماند

بخت حافظ گر ازین گونه مدد خواهد کرد

زلف معشوقه بدست دگران خواهد بود

جنگ هفتاد و دو ملت همه را عذر بنه

چون ندیدند حقیقت ره افسانه زدند

آسمان بار امانت نتوانست کشید

قرعهٔ کار بنام من دیوانه زدند

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظاؔ مخروش

نہ گوئمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ میخورد نہ ماہ پارسا می باش

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

ما از یاراں چشم یاری داشتیم
خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم

برد ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

بہ آب کوثر و زمزم سفید نتواں کرد
گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست در آں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

گر مسلمانی از اینست کہ حافظؔ دارد

آہ اگر از پئے امروز بود فردائے

یہ اشعار جس موقع پر لکھے یا بولنے میں آجاتے ہیں موتی کی طرح چمکتے ہیں اور کلام کا لطف ایک سے دس گنا ہو جاتا ہے۔

خواجہ کے سیکڑوں مضمون اردو شعراء نے اردو زبان میں نقل کیے ہیں، خاص کر غالبؔ نے، ہم اس موقع پر اس قسم کے چند اشعار بطور مثال کے لکھتے ہیں:

خواجہؔ:

منکہ ملول گشتمے از نفس فرشتگاں
قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالبؔ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

خواجہؔ:

بخدا کہ رشکم آی کہ نظر کنم برویش
کہ نظر دریغ باشد بچنین لطیف روئے

غالبؔ:

دیکھئے قسمت کہ آپ اپنے یہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خواجہؔ:

جام جہاں نماست ضمیر منیر دوست
اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجتست

غالبؔ:

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

خواجہ:

گر ز مسجد بخرابات شدم خردہ مگیر
مجلس وعظ دراز ست و زماں خواہد شد

قائم:

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

خواجہ:

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

رند:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

خواجہ:

نخواہد ایں چمن از سرو لالہ خالی ماند
یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

برق:

ایک جاتا ہے تو آتا ہے عدم سے دوسرا
اس کی محفل کا کبھی خالی مکاں ہوتا نہیں

خواجہ:

در دیست درد عشق کہ ہیچش علاج نیست
چندانکہ سعی بیش نمائی بتر شود

مومنؔ:

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

خواجہؔ:

ارباب حاجتیم و زبان سوال نیست
در حضرت کریم تمنا چہ حاجت ست

نامعلوم:

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال مجھے

خواجہؔ:

آئین تقوےٰ ما نیز دانیم
لیکن چہ چارہ با بخت گمراہ

غالبؔ:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

خواجہؔ:

میخواست گل کہ دم زند از رنگ و بوئے دوست
از غیرت صبا نفسش در دہاں گرفت

سوداؔ:

چمن میں گل جو کل دعوۂ جمال کیا

صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

خواجہ کے کلام کی نسبت رائیں

خواجہ کی زندگی میں ہی ان کا کلام بے نظیر تسلیم کرلیا گیا اور لوگ ان کو ملہم صوفی خیال کرنے لگے۔ مولانا جامیؔ جن کی ولادت خواجہ کی وفات کے پچیس ہی سال بعد ہوئی ہے اور جو فارسی شاعری کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں، ان کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا لقب دیتے ہیں کیوں کہ ان کی زبان کے حقیقی عرفان کے راز اور صوفیانہ اسرار اس طرح صفائی اور بے ساختگی کے ساتھ نکلتے ہیں کہ غیب سے القا ہورہے ہیں۔

مولانا جامیؔ کے علاوہ تمام شعرا فارس خواجہ کے کلام کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے مقابلے کا خیال کرنا بھی بے ادبی سمجھتے ہیں۔ صائبؔ فارسی غزل گوئی کا چوتھا رکن اور آخری استاد تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے خواجہ کی غزل پر غزل لکھی۔ مقطع میں اس طرح عذر خواہی کرتا ہے۔

روا ست صائب اگر نیست از رہ دعوے
تتبع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی است

اے صائب! اگر دعویٰ نہ ہو تو خواجہ کی غزل پر غزل کہنی جائز ہے اگر چہ یہ بھی بے ادبی ہے۔

سلیم طہرانی لکھتا ہے:

سلیم معتقد نظم خواجہ حافظؔ باش
کہ نشہ بیں بود در شراب شیرازی

اے سلیم خواجہ حافظؔ کے اشعار کا معتقد رہ کیوں کہ شیراز کی شراب میں نشہ زیادہ ہوتا ہے

مغرور شاعر عرفی تمام شعرائے فارس کو اپنے نزدیک ہیچ سمجھتا ہے چنانچہ قصیدہ

گویوں کے بادشاہ حسان العجم خاقانی کے متعلق کہتا ہے۔

زمانہ پیس کے سرا جلوہ داد تا از رشک
بداغہائے پس از مرگ سوخت خاقانی

دیکھ جب سے زمانے نے مجھ کو شہرت دی، رشک کے داغوں سے مرنے کے بعد بھی خاقانی جل اٹھا

ظہیر فاریابی کا مذاق اڑاتا ہے:

ازاں ز دست ہنر ہائے خود ہمی نالم
کہ بر ظہیر ازیں شیوہ ہیچ در نکشاد

میں اس لیے اپنے کمالات سے نالاں ہوں کہ ظہیر پر اس فن کو کوئی دروازہ نہیں کھولا گیا

انوری جو کہ فارسی شاعر کے تینوں پیغمبروں میں سے ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند
فردوسیؒ و انوریؒ و سعدیؒ

اس کے متعلق کہتا ہے:

تفرجیکہ من از بہر روح ساز دہم
نہ انوریؒ نہ فلانی دہد نہ بہمانی

جو خوشی کہ میں روح کے لیے تیار کرتا ہوں وہ نہ انوری تیار کر سکتا ہے نہ کوئی اور دوسرا۔

ہندستان غریب نے ایک شاعر اب تک پیدا کیا ہے یعنی، امیر خسرو، اس کو بھی اپنی زلہ خوار بنانا چاہتا ہے:

بروح خسرو ازیں فارسی شکر دادم
کہ کام طوطی ہندستان شود شیریں

خسرؔو کی روح کو اس فارسی ہے میں نے شکر دی کہ طوطی ہندستان کو بھی منھ میٹھا ہو جائے

اور تو اور غزل گویوں کے پیرو مرشد شیخ سعدؔی جیسے بزرگ کو بھی تو اس نے نہیں چھوڑا، کہتا ہے:

نازش سعدیؔ بمشت خاک شیراز از چہ بود

گر ندانستے کہ گرد مولد و ماد اے من

شیراز کی ایک مشت خاک پر سعدؔی کیوں ناز کرتا۔ اگر اس کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ میرا مقام اور وطن ہوگا

مگر خواجہ کے سامنے ادب سے گردن جھکا دیتا ہے اور سر تسلیم خم کر کے کہنے لگتا ہے:

بگرد مرقد حافظؔ کہ کعبۂ سخن است

در آمدیم بعزم طواف در پرواز

حافظؔ کے مزار کے ارد گرد جو کہ شاعری کا کعبہ ہے طواف کے ارادے سے ہم نے اڑنا شروع کیا

عرؔفی، نکتہ چین عرؔفی، خود پسند عرؔفی کا خواجہ کے مرقد پاک کو کعبۂ سخن کہنا ایسے کئی دفتروں سے زیادہ ہے جو ان کی تعریف میں لکھے جائیں۔ ایک فارسی کا شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا کہتا ہے:

حافظؔ کہ لسان غیب آمد

در گلشن جان کسیب آمد

حافظؔ کہ لسان الغیب ہے (ان کا کلام) باغ جان کے لیے بمنزلہ آب رواں کے ہے۔

نا کردن احترام شعرش

در معرض عقل عیب آمد

اس کے اشعار کی عزت اور قدر نہ کرنا عقل کے نزدیک برا ہے

نہ صرف شعراء بلکہ ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں نے ہر ملک اور ہر قسم کے سخن شناسوں نے خواجہ کے کلام کے حسن پر مدح و ثنا کے پھول نثار کیے اور تعریف و توصیف کے نغمے گائے۔

نہ من بران گل عارض سرایم و بس

کہ عندلیب تو از طرف ہزار انند

مولانا سودی فرماتے ہیں:

حافظ کا کلام نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ وہ آب حیات میں نہایا ہوا ہے اور کپتان کلارک مدح سرائی کرتا ہے:

فردوسی کی فصیح و بلیغ رزمیہ اور سعدی کی پاکیزہ اخلاقی شاعری بے شک ایک اونچے درجے کی مستحق ہے لیکن حافظ کا کلام ان سے بھی بہت زیادہ بلندی کا حقدار ہے۔

اس کے تمام کلام میں ایک جدت کی روح ہے۔ وہ سوائے ان خیالات کے جن کا صحیح فطرت اقتضا کرتی ہو اور کوئی خیال اپنی شاعری میں نہیں آنے دیتا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے جس سے کلام کی خوبی میں نقص واقع ہو سخت نفرت کرتا ہے۔

دنیا کے کسی ملک میں کبھی کوئی ایسا عالی دماغ اور طباع شاعر نہیں پیدا ہوا۔ جدت جو اہل کمال کا حصہ ہے، اس کے اندر اس قدر ہے کہ لوگ اس کو ملہم خیال کرتے ہیں۔ اس کے اشعار لطافت، سادگی، غیر مصنوعی شاعرانہ رنگینیوں اور زبردست جذبات سے لبریز ہیں۔ گرمی، متانت اور زندہ دلی اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ وہ زمانے کا انقلاب، دنیا کی بے ثباتی، ریاکاری کا فریب دکھاتا ہے۔ خالق کی عظمت، جوانی کی دشمنی، مذہب کی وسعت اور محبت کی خوبیاں بیان کرتا

ہے۔اس کے اشعار دل کش، بے نظیر اور لاثانی اسلوب بیان رکھتے ہیں۔اس کی غزلیں رذالت پست ہمتی اور خود پسندی سے مبرا ہیں۔ان کا طرز و ادا بے انتہا انوکھا ہے۔اور وہ مصنوعی ظرافتوں، مشکل بندشوں اور بعید از قیاس استعاروں سے پاک و صاف ہیں۔ان میں سوز بھی ہے اور شوخی بھی، تعریف بھی ہے اور شکایت بھی۔جس طرح وہ ولولہ انگیز ہیں اسی طرح پر تمکنت ہیں۔ان کا اسلوب بیان بے عیب و دل نشیں اور نہایت بلیغ ہے۔کسی شعر سے ایک لفظ کا گھٹانا ایک حسن کا کم کر دینا ہے۔اس کا ہر ہر شعر جادو ہے۔زبان صاف ستھری، شیریں اور خوش گوار ہے۔

اس کے شعروں کی روانی اور سلاست پڑھنے والوں کو خواہ وہ زاہد ہو یا رند مسرور کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔نوجوان ان کو اپنے جوانی کے ایام مزوں میں گزرنے کے لیے سند سمجھتا ہے اور گوشہ نشیں زاہد ان کو عرفان کے اسرار کا مرقع خیال کر کے دعاؤں کی طرح پڑھتا ہے۔

چارلس اسٹورٹ لکھتا ہے:

''حافظ ایران کے تمام شاعروں میں فطرتی جذبات کا سب سے زیادہ راز داں ہے۔اس کا کلام صرف کلام الٰہی سے کم درجے کا اور باقی سب سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔وہ سادہ اور لطیف ہے اور تصنع اور خود پسندی سے پاک ہے، بعض بعض اشعار میں جو فخر و مباہات کی جھلک نظر آتی ہے ان کو خود پسندی نہیں کہہ سکتے۔ہر شخص جس کا مذاق صحیح ہے سمجھ سکتا ہے کہ یہ سخن گسترانہ شوخیاں ہیں۔''

مسٹر براؤن سعدیؔ کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''سعدیؔ کی غزلیں نہایت دل چسپ اور نہایت دل فریب ہیں اور سوائے اس کے ہم وطن حافظؔ کی غزلوں کے اور کسی سے کم درجہ نہیں رکھتیں۔''

بکنل تعریف کرتا ہے:

"حافظ زندہ دلی کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات بیان کرتا ہے اس کا فطری اور برجستہ کلام دل آویز تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ دنیا کے علم و ادب میں ایک نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی خاص سلطنت میں کوئی اس کا ہم پایہ نہیں ہے۔ اس کے کلام میں گو بے انتہا آزادی اور خوشی ہے مگر کہیں الحاد کا رنگ نہیں پایا جاتا۔ اس کی خوشی ساغر میں دہریت کی تلخی مطلق نہیں ہے۔ اس پر جس طرح ایشیا شیدا ہے۔ اسی طرح یورپ بھی مفتوں ہے۔"

ڈاکٹر گاٹھیل لکھتے ہیں:

"حافظ کا دماغ روحانی سرزمین میں چکر لگاتا ہے۔ جب ہم اس کے کلام کا لطف اٹھا رہے ہیں، اس وقت یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ آیا وہ مورتیں جن کی وہ تعریف کرتا ہے گوشت اور خون کی بنی ہوئی ہیں یا روحانی ہیں جن پر ایک پر اسرار پردہ پڑا ہوا ہے۔"

مسٹر اوسلی کا قول ہے:

"حافظ کا کلام نہایت صاف اور سادہ، شیریں اور ترنم ریز ہے، وہ مخفی جذبات اور حقیقی اسرار سے لبریز ہے، مگر ان سب سے بڑھ کر اس کا وہ بلند اسلوب بیان ہے جس کی برابری آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔"

الغرض خواجہ کا کلام ایک ہرا بھرا اور پھولا پھلا باغ ہے، جو اس کی سیر کرتا ہے اس کے دل و دماغ کو فرحت اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے اور جو اس میں آتا ہے اس کی خوبیاں دیکھ کر محو ہو جاتا ہے اور بے ساختہ اس کی زبان سے تعریف نکلتی ہے۔

غزل گفتنی و دُر سفتی بیاد خوش بخواں حافظؔ

کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

ہم نے یورپین مصنفین کی رائیں صرف اس لیے نقل کی ہیں کہ یہ معلوم ہو

جائے کہ یورپ میں خواجہ کے متعلق ادیبوں کے کیا خیالات ہیں اور وہ ان کے کلام پر کس قدر فریفتہ ہیں۔ ورنہ خواجہ کے کلام کی مقبولیت اور وقعت ان سے سب تعریفوں سے بلند تر ہے اور ایشیا والوں کے لیے ان کے کلام کی عظمت اور ان کی شاعری کا کمال ثابت کرنے کے واسطے ان رایوں کی ضرورت نہیں ہے۔

گوہر پاک تو از مدحت ما مستغنی است
فکر مشاطہ چہ با حسن خدا داد کند

چند روز ہوئے ہماری ملاقات ایک یورپین عالم سے ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں حافظؔ کا تذکرہ آیا۔ اس نے کہا کہ حافظؔ تو بہت بڑا شاعر ہے۔ اور یورپ میں اس کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ ہماری زبان میں متعدد ترجمے اس کے دیوان کے ہوئے ہیں اور ان کو اکثر لوگ پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ ایشیا کے لوگ اس کی اتنی قدر نہیں کرتے۔

ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ یورپ کو اب حافظ کے ساتھ ذوق ہو چلا ہے اور وہاں کے لوگ اس کی قدر کرنے لگے ہیں اور حافظؔ کے کلام میں ایسی خوبیاں اور دلچسپیاں موجود ہیں کہ تمام دنیا اس کی قدر کرے گی مگر آپ کا یہ فرمانا کہ ایشیا کے لوگ اس کی اتنی قدر نہیں کرتے غلط ہے۔ قدر کیا ایشیا میں تو اس کے کلام کی پرستش ہوتی ہے:

اے گل تو دوش داغ صبوحی کشیدۂ
ما آں شقایقیم کہ با داغ زادہ ایم

اصلیت یہ ہے کہ خواجہ کے کلام کا حسن ایشیا والوں کے لیے بے نقاب ہے۔ وہ بے پردہ اس کا جلوہ دیکھتے ہیں، مست ہوتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ بخلاف اہل یورپ کے کہ مذاق اور زبان کے اختلاف کا پردہ بیچ میں حائل ہے اور وہ ترجمے کی عینک سے اس کا نظارہ کرتے ہیں جس سے ایک دھندلی سی تصویر اس کے حسن کی

ان کو نظر آتی ہے، مگر باوجود اس کے ان کی ہمت پر آفریں ہے کہ وہ علم پرستی کے ذوق میں سرگرمی سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں:

ہمت مرغ سحر خواں کا ہوں قائل کہ اسے
نالہ سے زمزمہ مقصود ہے تاثیر نہیں

خواجہ کے کلام کا اثر

ارسطو نے شاعری کو بھی منطقی دلائل کی فہرست میں درج کیا ہے۔ یعنی جس طرح مختلف قسم کی دلیلوں سے نتیجے ثابت ہوتے ہیں اور ان میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ انسان کو کسی بات کے تسلیم کرنے پر مجبور کریں اسی طرح شاعری میں بھی یہ طاقت ہے۔

شاعری شراب سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ شراب انسان کے دماغ پر اپنا اثر ڈال کر اس کو مدہوش بنا دیتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی اپنا اثر ڈال کر بے خود کر دیتی ہے۔

ہر قوم کی شاعری کا ایک اندرونی اثر جس کا ظاہر میں احساس نہیں ہوتا، آہستہ آہستہ اس پر ہوتا رہتا ہے۔ اور جس قوم کی شاعری میں جیسے خیالات ہوتے ہیں اس قوم کے اخلاق و عادات میں ویسی ہی ان کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

عربوں کی شاعری بہادری، فیاضی، خود داری اور مہمان نوازی وغیرہ کے خیالات سے لبریز ہے۔ چنانچہ یہ اوصاف بھی ان میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔

چوں کہ فارسی شاعری میں زیادہ تر حسن پرستی کے خیالات ہوتے ہیں اس وجہ سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کا اثر انسان کے اخلاق پر اچھا نہیں پڑتا، خاص کر نوجوانوں کے حق میں یہ نہایت ہی مضر ہے۔ اور خواجہ کا دیوان چوں کہ بادۂ شاعری کی روح ہے، اس لیے وہ اور بھی زیادہ جلد پڑھنے والے کو مست اور متوالا بنا دیتا

ہے اور نوجوانوں کا دل و دماغ اس کے برداشت کی مطلق طاقت نہیں رکھتا۔

چنانچہ یہ مشہور ہے کہ شہنشاہ عالم گیر نے ممانعت کر دی تھی کہ کوئی اس کو نہ پڑھے کیوں کہ عوام الناس صرف اس کے ظاہری معنی سمجھ کر گمراہ ہوتے ہیں اور اس کے حقیقی مقصد اور صوفیانہ اسرار کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

مگر اس کے ساتھ ہی جہاں پناہ ایک نسخہ دیوان کا ہر وقت اپنے سرہانے رکھتے تھے۔ ہمارے ایک ستم ظریف دوست کا مقولہ ہے کہ فارس کو دستوری نہیں جمہوری سلطنت بھی مل جائے لیکن جب تک وہاں دیوان حافظؔ اور شراب موجود ہے اس وقت تک وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ بھلا جس ملک میں اس قسم کے شعروں کا:

حدیث از مطرب و مے گو دراز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را
رموز مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظاؔ مخروش

کا دن رات چرچا ہو وہاں کے لوگوں میں ذمے داری برداشت کرنے کی قابلیت کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا حالیؔ ''حیات سعدی'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ حافظؔ کی غزل مجالس اور محافل میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرض کہ کسی شے کو نظر بازی اور شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آزارگی، رسوائی، بدمستی، بے سروسامانی

وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل وتدبیر سے کبھی کام نہ لینا، توکل وقناعت کے نشے میں اپنی ہستی مٹا دینا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا و مافیہا کے زوال وفنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم وحکمت کو لغو ولوچ اور حجاب اکبر جاننا، حقائق اشیا میں کبھی غور وفکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً رائیگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعری کی فصاحت وبلاغت اور مطرب ورقاصہ کی خوش آوازی اور حسن وجمال اور مزامیر کے لیے ان کو لے اڑتی ہے ان کی تاثیر دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ اعتقاد بھی ہو کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جن کا شعر شریعت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما ہے اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی دل نشیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک نقل کرنے کے بعد یکایک دیدہ خیال کے سامنے خواجہ کی نورانی شکل آ گئی جو مجھ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

میں نے سوچا کہ شاعری کو عمل کرنے کے لیے کوئی نہیں پڑھتا بلکہ جذبات کی تیغ کو سان پر رکھنے کے لیے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ شاعری روحانی لطیف جذبات کی غذا ہے۔ جس طرح سریلی آواز سے روح کو سرور ہوتا ہے اسی طرح اچھے اشعار اس کو بالیدگی ہوتی ہے۔ بعض وقت صرف ایک شعر سے روح کی اصلی

بنیاد صرف ایک جذبے پر ہے یعنی محبت ہر، وہ محبت جو دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے، وہ جس سے انسان مجسم نور بن جاتا ہے جس سے اس کی پرستش ہونے لگتی ہے۔

اسی محبت کو وہ شراب سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کی تعریف سے ان کا تمام دیوان لبریز ہے۔ان کا تمام کلام حقیقت و عرفان کا نچوڑ اور سلوک وتصوف کی جان ہے۔اس میں ہزار ہا بیش قیمت اسرار ہیں، خاص کر اہل دل کے لیے تو وہ روحانی شراب ہے۔وہ اس پر جان ودل سے فریفتہ ہیں اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر قوم کے لوگ بھی۔مہرشی دیواندرانا تھ ٹھاکر جی اپنے معتقدوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ دیوان کو مطالعے میں رکھیں اور خود وہ جس زمانی میں کوہ ہمالیہ میں تپسیا اور ریاضت میں مصروف تھے تو یہی دیوان ان کا انیس و ہمدم تھا،

ایسا نفیس کلام جس سے ہر مذہب وملت کے برگزیدہ لوگ روحانی سرور حاصل کریں، اکابر مشائخ اور صوفیہ کرام اس کو آب حیات سمجھیں، شاعر اور ادیب اس پر جان دیں، اگر سادہ لوحوں پر اس سے اچھا اثر نہ پڑے تو کیا اس کلام کی وقعت میں کچھ بھی فرق آ سکتا ہے؟

کیا یوسف کے حسن کی قدر اس سے کچھ بھی کم ہوسکتی ہے کہ اس نے زلیخا کو رسوا کیا۔

اصلیت یہ ہے کہ غزلیں عام طور پر محض بوالہوسی اور عشق مجازی کے جذبے کو بر انگیختہ کرتی تھیں لیکن سعدیؔ و حافظؔ وغیرہ نے ان میں عشق حقیقی کی بھی روح پھونکی اور اپنی وجدانی کیفیات اور غیبی واردات کو گل وبلبل اور مے وساقی کے افسانے میں ادا کیا تا کہ عوام کو بھی اس سے دلچسپی رہے اور ان کے جذبات پاکیزہ ہوں، کیوں کہ کنایہ ہمیشہ تصریح سے زیادہ موثر ہوتا ہے:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں

گفتہ آید در حدیث دیگراں

انھوں نے غزل کو جہاں وہ ہوس پرستی کا ذریعہ تھی، روحانی پاکیزگی کا وسیلہ بنا دیا اور بادۂ انگور کو شراب طہور کر دیا۔

مولانا حالی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ حافظ کی غزلوں کو قوم کے لیے خطرناک خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

حافظ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بے شک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش و الواط کو بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیت ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ بر انداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔

مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا شاعرانہ جذبات کے مار ڈالنے سے قومیت زندہ ہوتی ہے؟ کیا قومی زندگی صرف ایک خشک زندگی کا نام ہے؟ ہم نے خود خواجہ سے سوال کیا کہ فرمائیے قوم کا مبصر آپ کی شاعری کو قومیت کے لیے سم قاتل بتاتا ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟ خواجہ نے جواب دیا:

گویند رمز عشق مگوئید و مشنوید
مشکل حکایتیست کہ تقریر مے کنند

حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ جذبات قومیت کے لے زیور ہیں۔ قومیت خود ایک شاعرانہ جذبے کا نام ہے۔

ہم نے مانا کہ قوم کے پیٹ کو اس وقت علوم و فنون سے بھرنے کی ضرورت ہے اور شاعری یا موسیقی وغیرہ جو دماغی آسایش کی چیزیں ہیں آسودہ حالی اور فارغ البالی ہیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن کیا موتی محض اس لیے کہ کھائے نہیں جاتے پائمال کر دیئے جائیں نہیں، ان کی قدر کرو کیوں کہ حسینوں کے گلے کی زینت ہیں

اور شاہانہ تاجوں میں چمکتے ہیں۔

فالیں

سرخی لکھنے کو تو دی مگر شبدیز قلم ابھی اس میدان میں قدم بھی نہ رکھنے پایا تھا کہ دل نے زور سے اس کی لگام کھینچ لی اور کہا کہ ہیں!! فالیں! مسلمان کہیں فالوں پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں:

میں: ہزاروں آدمی دیوان حافظؔ میں فالیں دیکھتے ہیں ان کو مانتے ہیں پھر حافظؔ کا سوانح نگار اس مقبول عام اور دلچسپ عنوان کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہے۔

دل: کوئی عقیدہ رکھا کرے تمہیں اس سے کیا تم جانتے نہیں کہ نبی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نجومیوں کو جھٹلایا اور فرمایا کذب المنجمون برب الکعبۃ (خدا کی قسم نجومی جھوٹے ہوتے ہیں)، بھلا سوچو تو سہی کہ غیب کی بات بھی کوئی بتا سکتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے: وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمھا الا ھو (اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا) مسلمانوں کو ممانعت کی گئی ہے کہ وہ فال اور شگون نہ لیا کریں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ پیغمبرؐ صاحب نے سچے مسلمانوں کی ایک علامت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ شگون نہیں لیتے۔

میں: مگر میں تو ادبی دلچسپی کے خیال سے لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے پہلے کئی مصنفوں نے اسی عنوان پر کتابیں لکھی ہیں، میں ہی اس بدعت کی بنیاد نہیں ڈالتا۔

دل: غلطی کتنے ہی آدمیوں سے ہو پھر بھی وہ غلطی ہے۔ رہی ادبی دلچسپی، سو جو لوگ کچے عقیدے کے ہیں وہ اس کا کب خیال کریں گے۔ تمہاری تو ادبی دلچسپی ہوگی اور وہاں عقیدے بگڑ جائیں گے۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

میں: مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام کے خیال سے خواص کو بھی جو عقل و فہم رکھتے ہیں، اس لطف سے محروم رکھوں۔ مجھے کسی کے عقیدے سے کیا واسطہ اپنے کام سے

کام ہے۔تاریخ نویسی کے قانون کے مطابق اس موقع پر مجھ پر فرض ہے کہ اس عنوان پر کچھ ضرور لکھوں۔

دل: لوگوں کے عقیدے کو خراب کرنا قطعاً ناجائز ہے اور سراسر خلاف شرع ہے۔

میں: اچھا لاؤ خود دیوان حافظؔ میں دیکھیں، خواجہ بھی اس کو خلاف شرع بتاتے ہیں یا نہیں۔

دل: ہیں! خلاف شرع باتوں پر اصرار کرنا سخت گناہ ہے۔

میں: خیر دیکھنے میں کیا ہرج ہے، دیوان کھولتے ہی یہ شعر نظر پڑا۔

خدارا محتسب ما را بفریاد دف و نے بخش

کہ ساز شرع زیں افسانہ بیقانوں نخواہد شد

خدا کے لیے اے محتسب ہمیں دف و نے کی فریاد کے طفیل بخش دے کیونکہ شریعت کا باجا ان باتوں سے بے آسرا نہ ہوگا۔

دل: یہ بھی اتفاق کی بات ہے۔اس کی پیروی ہرگز مناسب نہیں۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الشعراء یتبعھم الغاوٗن (شاعروں کی پیروی وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں)

میں: اب تو بفتوائے حافظؔ میں ضرور لکھوں گا۔

دل: نہیں نہیں، ہرگز نہیں، کیا فائدہ محنت بھی کرو اور گنہ گار بھی بنو۔

میں: ہر کام کی سزا و جزا نیت کے مطابق ہوتی ہے۔

دل: یہ مانا، لیکن قصداً ایسا کوئی کام کرنا جس سے خلقت خدا توہم پرستی میں مبتلا ہو جائے بہت بڑا گناہ ہے اور ایسا شخص شیطان ہے۔

میں: اچھا آپ جبریل بنے بیٹھے رہیں اور مجھے لکھنے دیجئے۔

چل رے خامہ بسم اللہ

اسلام سے پیشتر دنیا کی تمام قوموں میں فال اور شگون لینے کا رواج تھا۔ اہل روم بھی جو اس زمانے میں تمدن اور شائستگی میں بلند ترین درجہ رکھتے تھے اس میں مبتلا تھے اور وہ بھی جاہل عربوں کی طرح چڑیوں کے اڑنے سے اور ان کی آواز سے شگون لیتے تھے۔۔ بہت سے لوگ اس غرض کے لیے نجومیوں اور کاہنوں کے پاس جاتے تھے۔

عام عیسائی قوموں میں کتاب مقدس سے بھی فال نکالنے کا رواج تھا اور چوں کہ ہومر کی الیڈ اور اوڈیسی دونوں کتابیں بھی ان میں بے حد مقبول تھیں، وہ لوگ ان سے بھی فالیں نکالا کرتے تھے۔ ان کی خوش اعتقادی یہاں تک بڑھ گئی کہ بڑے بڑے حاذق طبیب لاعلاج مریضوں کے سرہانے ہر رات کو کوایک ایک حصہ الیڈ کا رکھواتے تھے اور اس کی برکت سے شفا کی امید رکھتے تھے۔

اسلام کے نور نے جہاں تمام توہم پرستی کی ظلمتوں کو مٹا دیا وہاں فال اور شگون کے مشغلے کو بھی بے حقیقت کر دیا۔ مگر انسان میں جہاں بہت سی کمزوریاں ہیں وہاں ایک یہ بھی کمزوری اس کے اندر ہے کہ وہ اپنے آیندہ حالات کے جاننے کا بڑا شائق ہوتا ہے، خاص کر جب وہ کوئی ارادہ یا کام کرتا ہے تو اس کے انجام اور نتیجے کے دریافت کرنے کا ہر وقت اس کو خیال رہتا ہے، اور گو وہ کیسا ہی پختہ عقیدے کا ہو اور اس بات پر کامل یقین رکھتا ہو کہ غیب کا علم کسی مخلوق کو ہو نہیں سکتا مگر جب اپنے متعلق کسی پیشین گوئی کو سنتا ہے تو ضرور دل چسپی لیتا ہے۔ چنانچہ ابھی اسلام کو دو صدیاں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں ہندستان کے جوتشی پہنچے اور ان کی وجہ سے عربوں کو پھر فال اور شگون اور اچھی بری ساعت دیکھنے کا چسکا پڑ گیا اور رفتہ رفتہ یہ بیماری تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔

خاص کر فارس میں استخارہ، فال اور شگون وغیرہ کا بہت ہی زیادہ رواج تھا۔ سعدیؔ اور حافظؔ کے کلام میں جابجا اس کا ذکر ہے۔ بعض بعض شعروں سے معلوم ہوتا

ہے کہ خواجہ حافظ خود بھی فال نکالا کرتے تھے، مثلاً:

از غم ہجر مکن نالہ و فریاد کہ دوش
زدہ ام فالے و فریاد رسے می آید
روز ہجران و شب فرقت یار آخر شد
زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد

بہت سے لوگ قرآن سے فال نکالتے تھے۔ بعضوں نے یہ سوچ کر کہ قرآن کا درجہ اس سے بلند ہے اور اس سے فالیں نکالنی بے ادبی ہے، مولانا روم کی مثنوی اور شیخ سعدی کی بوستان کو اس کام کے لیے منتخب کیا، مگر دیوان حافظ سب سے زیادہ موزوں خیال کیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ کی شاعری کو انسان کے عام معاملات سے بہت زیادہ تعلق ہے، کیوں کہ انھوں نے روزمرہ کے واقعات، مشاہدات اور پیش نظر چیزوں سے شاعرانہ خیالات اخذ کیے ہیں۔ اس لیے جو سوالات انسانی معاملات کے متعلق کیے جاتے ہیں ان کے جواب میں اکثر مناسب اشعار نکل آتے ہیں۔

علاوہ بریں چوں کہ ان کے اشعار عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا پہلو رکھتے ہیں اس لیے ان کے معانی میں بہت بڑی وسعت ہوتی ہے اور طرح طرح کی تاویلوں کی گنجائش نکل سکتی ہے اور فال دیکھنے والا ہیر پھیر کر اپنی منشا کے مطابق اس میں معنی پہنا سکتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ خواجہ کے اشعار بے نظیر ہیں اور جب کسی سوال کے جواب میں ان کا کوئی نکلتا ہے تو اپنے انوکھے طرز بیان سے دل میں کھب جاتا ہے اور فال کی دل چسپی کو بڑھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی خواجہ چوں کہ بہت بڑے صوفی اور ولی اللہ تھے اور ان کے کلام پر صوفیانہ تقدس کا غلاف چڑھا ہوا ہے، اس لیے عوام الناس ان کے روحانی

تصرف کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں، چنانچہ خواجہ کا معتقد خاص پنڈت خوشگو کہتا ہے کہ:

''میں نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ خواجہ سے جس بات کا سوال کیا جاتا ہے اس کا جواب نہایت ٹھیک دیتے ہیں۔ اس کے لیے بھی میں نے دیوان میں دیکھا، مجھ کو یہ شعر ملا۔''

معجز است ایں شعر یا سحر حلال

ہاتف آرد ایں سخن یا جبرئیل ا ے

میں سمجھ گیا کہ بے شک خواجہ کی شاعری میں کوئی غیبی آواز شامل ہے۔

الغرض ان تمام وجوہات سے دیوان حافظؔ میں پوری قابلیت اس بات کی موجود تھی کہ لوگ اس سے تفاؤل کریں۔نظیری نیشاپوری کہتا ہے:

حسب حال خود کس از مجموعۂ بارے نخواند

حافظ شیراز را دیوان فرخ فال کو

چنانچہ لوگوں نے کثرت کے ساتھ اس سے تفاؤل کرنا شروع کیا اور بہت سے لوگوں نے ان فالوں کو کتاب کی شکل میں جمع کیا۔حاجی خلیفہ کشف الظنون میں لکھتا ہے کہ محمد بن شیخ محمد ہردی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں خواجہ حافظؔ کے لسان الغیب ہونے کا ثبوت دیا ہے اور ان کے دیوان کی بہت سی فالیں جو مناسب موقع کے واقع ہوئی ہیں، اس میں جمع کی ہیں۔پھر آگے لکھتا ہے ''مولانا حسین کفوی متوفی ۹۸۰ھ نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب ترکی زبان میں لکھی ہے''۔

اس کی ابتدا یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب خواجہ کا انتقال ہوا تو بعض علماء نے ان کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کیا۔شاہ منصور بھی جنازے میں شریک تھا، اس نے سبب دریافت کیا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ حافظؔ کا کلام ملحدانہ ہے اس لیے ان کے جنازے کی نماز جائز نہیں۔بادشاہ نے کہا کہ کیا ثبوت ہے؟ انھوں نے کہا کلام منگایا جائے تو ہم الحاد ثابت کر سکتے ہیں۔اس وقت ان کی غزلوں کے

مسودے منگائے گئے۔ پہلا ہی ورق جو اٹھایا تو اس میں یہ شعر نکلا:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظؔ

کہ گرچہ غرق گناہست میرود بہ بہشت

حافظؔ کے جنازہ سے قدم نہ روکئے کیوں کہ وہ اگر چہ گناہ میں غرق ہے لیکن بہشت میں جا رہا ہے۔

اس تائید غیبی کو دیکھ کر سب خاموش ہو گئے اور بلا چون و چرا جنازے کی نماز ادا کی۔ اسی دن سے خواجہ کا نام لسان الغیب رکھا گیا اور لوگ ان کے دیوان سے تفاول کرنے لگے۔

☆☆☆

۱: مذکورہ بالا دونوں نسخوں میں یہ شعر نہیں ہے۔

☆☆☆

لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا خواجہ کو 'لسان الغیب' اور 'ترجمان الاسرار' کا خطاب سب سے پہلے مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں جو ۸۷۵ھ میں لکھی گئی ہے، دیا ہے مگر اس لیے نہیں کہ وہ غیب کی باتیں بتاتے ہیں کیوں کہ مولانا جامی نے خود ہی اپنی دوسری کتاب بہارستان میں جو ۸۹۲ھ میں انھوں نے لکھی ہے، لسان الغیب کے لقب کی اس طرح تشریح کی ہے کہ حافظؔ کے اشعار بلا تکلف اس صفائی کے ساتھ ان کی زبان سے نکلتے ہیں کہ گویا عالم غیب سے القاء ہو رہے ہیں۔

مگر مولانا آزاد بلگرامی کی جو تفاول کے معاملے میں نہایت خوش اعتقاد ہیں اس معنی سے تسلی نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ خواجہ کے لسان الغیب کہنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ وہ غیب کی باتیں بتا دیتے ہیں، چنانچہ وہ خواجہ کی تعریف میں کہتے ہیں:

مرداں ز خاک ہم خبر آسمان دہند

فال کلام حافظ شیراز کن لحاظ

ہندستان کے بادشاہوں میں ہمایوں اور جہاں گیر فالوں کے بڑے معتقد تھے اورزیادہ تر دیوان حافظ سے تفاول کیا کرتے تھے۔ایک نسخہ دیوان حافظ کا جو ہمایوں اور جہاں گیر کے پاس بھی رہا ہے،اب بانکی پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ان دونوں شہنشاہوں نے اپنی کئی فالیں اور یادداشت جوانھوں نے دیوان سے نکالی تھیں مع سنہ و تاریخ کے اس کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ہم مولوی عبدالمقتدر صاحب کے خاص طور پر شکر گزار ہیں جنھوں نے نہایت جستجو اور تحقیق کے ساتھ تواریخ سے مطابقت دے کر ان کی تفصیل دریافت کی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو لکھا۔

ہمایوں نے شیر شاہ کے مقابلے میں اپنے خود غرض بھائیوں مرزا کامران اور مرزا عسکری کو اپنے ہمراہ متحد کرنے کے لیے بڑی کوشش کی لیکن وہ یوسف کے بھائی نکلے۔انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور اس سے الگ رہے۔آخر شیر شاہ نے ۹۴۷ھ میں ہمایوں کو شکست فاش دی اور وہ مجبوراً ہندستان سے بھاگ کر فارس میں طہماسپ کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔

۹۶۱ھ میں جب وہاں سے فوج لے کر پھر ہندستان پر چڑھائی کا ارادکیا،اس وقت اس نے دیوان حافظ میں فال دیکھی،یہ شعر نکلا:

عزیز مصر بزعم برادران غیور
ز قعر چاہ بر آمد بہ اوج ماہ رسید

عزیز مصر اپنے بھائیوں کی منشا کے خلاف کنویں کی پستی سے نکل کر چاند کی بلندی پر پہنچا

پہلی لڑائی قندھار میں ہوئی جس میں مرزا عسکری گرفتار ہوا،دوسری کابل میں، جس میں کامران نے شکست کھائی،پھر ہندستان کی طرف بڑھا،اس وقت بھی فال

دیکھی، یہ جواب ملا۔

دولت از مرغ ہمایوں طلب و سایۂ او
زانکہ با زاغ و زغن شہپر دولت نبود

مرغ ہمایوں (ہما) کے سایہ میں دولت حاصل کرو، چیل اور کوے کے پاس دولت کے پر نہیں ہوتے۔

آخر وہ ایک مقابلے کے بعد ۹۶۲ھ میں دہلی کے تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑے عرصے کے بعد عادلی نے صوبہ بہار سے لے کر جون پور تک اپنا قبضہ جما لیا اور خود مختاری کا علم بلند کیا۔ سلطان محمد خاں صوبے دار بنگالہ نے اس پر فوج کشی کی مگر عادل نے ہیموں کی مدد سے اس کو شکست دے دی۔ ہمایوں نے یہ کیفیت دیکھ کر خود اس کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک دیوان حافظؔ میں بھی فال دیکھی کہ نتیجہ کیا ہوگا، یہ شعر نکلا:

نظر بر قرعۂ توفیق و یمن دولت شاہ است
بدہ کام دل حافظؔ کہ فال بختیاراں زد

بادشاہ کے دولت کے عروج اور توفیق الٰہی کی فال نکلتی ہے، حافظؔ کے دل کا مقصد پورا کر کیوں کہ اس نے خوش قسمتی کی فال نکالی

ہمایوں نے اس فال پر جو یادداشت لکھی ہے اس میں لکھتا ہے کہ "انشاء اللہ چوں فتح ولایات شرقی و مبارزان آں دیار مرا کردگار شوند رخوبے بخواجہ لسان الغیب فرستادہ شود۔" اس سے اس کی کمال عقیدت کا پتا ملتا ہے۔

جہاں گیر بھی اس سے کم معتقد نہ تھا۔ وہ لکھتا ہے "در بسیارے از مطالب بدیوان خواجہ رجوع نمودہ ام و کسب اتفاق آنچہ برآمدہ نتیجہ مطابق ہماں بخشیدہ و کم است کہ تخلف نمودہ"۔

جہاں گیر نے شہنشاہ اکبر کی آخری عمر میں مے نوشی بہت زیادہ کر دی تھی، اس

وجہ سے اکبر اس سے رنجیدہ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ابوالفضل جیسے لائق وزیر کو قتل کرا دیا۔ اس سے اس کے غصے کی آگ اور بھڑک گئی۔ جہاں گیر انھیں وجوہات سے الٰہ آباد میں رہتا تھا۔

۱۰۱۴ھ میں اکبر زیادہ بیمار ہوا۔ دربار کے بڑے بڑے امراء راجا مان سنگھ و خان اعظم وغیرہ اس جوڑ توڑ میں لگے کہ خسرو ولی عہد ہو اور جہاں گیر نہ ہو۔ اکبر کے کان جہاں گیر کی طرف سے بھرنے شروع کیے۔ جہاں گیر کو بھی ان باتوں کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ وہ بہت پریشان تھا کہ کیا، اگر جائے تو جان کا خوف اور نہ جائے تو خسرو کامیاب ہو جائے۔ آخر اس نے دیوان میں فال دیکھی۔ مندرجہ ذیل غزل نکلی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا حافظؔ نے یہ غزل صرف اسی موقع کے لیے لکھی تھی:

چرا نہ در پئے عزم دیار خود باشم
چرا نہ خاک سر کوئے یار خود باشم
غم غریبی و محنت چو بر نمے تابم
بشہر خود روم و شہریار خود باشم
ز محرمان سرا پردۂ وصال شوم
ز بندگان خداوند گار خود باشم
ہمیشہ پیشۂ من عاشقی و رندی بود
وگر بکوشم نہ مشغول کار خود باشم
چو کار عمر نہ پیداست بارے آں اولیٰ
کہ روز واقعہ پیش نگار خود باشم
بود کہ لطف ازل رہنموں شد حافظؔ
وگرنہ تا بد ابد شرمسار خود باشم

یہ فال دیکھتے ہی کشتی میں سوار ہو کر سیدھے آگرہ پہنچا۔ مان سنگھ نے شاہی محل

کا دروازہ بند کر لیا تا کہ اس کو اکبر تک نہ پہنچنے دے لیکن کسی ذریعے سے اس کو جہاں گیر کے آنے کی خبر ہوگئی۔ اپنے پاس بلایا۔ نگاہیں ملتے ہی تمام گذشتہ رنجشیں مٹ گئیں، محبت پدری نے مرنے والی ہڈیوں میں ایک ولولہ انگیز روح پھونک دی، اٹھ کر بیٹے کو سینے سے لگالیا، پیشانی چومی، سر پر بوسہ دیا، اس کے شمشیر خسروی عنایت کی، تاج شاہی اس کے سر پر رکھا اور برسر دربار اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

جہاں گیر لکھتا ہے ''ہم سعادت خدمت ورضا جوئی وحاضر بودن در واقعہ ناگریز دست داد وہم دولت موروثی روزی گشت کہ بعینہ ایں غزل بود''۔

حکیم ابوالفتح گیلانی کا بیٹا حکیم فتح اللہ خسرو کے طرف داروں میں سے تھا۔ وہ دن رات اس فکر میں رہتے تھے کہ جہاں گیر کو کسی طرح قتل کر کے خسرو کو قید خانے سے نکال کر اس کی جگہ تخت پر بٹھلائیں۔ قاسم علی نے جس کو جہاں گیر نے دیانت خاں کا خطاب دیا تھا اور اس کی خیر خواہی اور وفا داری پر اعتماد رکھتا تھا، جہاں گیر کو حکیم فتح اللہ کے ارادے سے مطلع کیا۔ جہاں گیر نے حکیم موصوف کو مطلع کیا اور پوچھا۔ اس نے قسم کھائی اور کہا کہ میں ہرگز خسرو کا حمایتی نہیں ہوں مگر اس کے تھوڑے ہی دن بعد اس راز کھل گیا اور وہ گرفتار کیا گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ جہاں گیر اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال کابل سے لاہور کو آرہا تھا۔ راستے میں مقام سرخاب میں قیام کیا، وہاں کسی جاسوس نے اس کو خبر پہنچائی کہ حکیم فتح اللہ، نورالدین (پسر غیاث الدین) اور شریف (پسر اعتماد الدولہ) اور بھی کئی اسی قسم کے لوگ پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اس نواح میں اس گھات میں لگے ہوئے ہیں کہ جہاں پناہ کو قتل کر کے خسرو کو تخت نشین کرائیں۔ یہ سنتے ہی فوراً فوج کا دھاوا ہوا اور باغی گرفتار کیے گئے۔ نورالدین اور شریف وہیں قتل کیے گئے اور فتح اللہ کی بابت یہ حکم ہوا کہ اس کذاب کا منہ سیاہ کر کے گدھے پر الٹا سوار کر کے منزل بہ منزل لے چلیں۔ دہلی پہنچ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت اس نے زمین

بوس ہو کر عذر خواہی کی اور کہا کہ لوگوں کے بہکانے سے میں سازش میں شریک ہو گیا تھا ورنہ میں تو دل سے جہاں پناہ کا نیک خواہ اور بندۂ درگاہ ہوں۔ جہاں گیر کے سامنے اس وقت دیوان حافظؔ رکھا ہوا تھا۔ اس لیے کہا کہ اچھا میں خواجہ سے پوچھتا ہوں، اگر تو سچا ہے تو چھوڑ دیا جائے گا۔ حکیم کی خوش قسمتی سے یہ شعر برآمد ہوا:

آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم

خاک می بوسم و عذر قدمش میخواہم

جس نے راستے کی خاک کی طرح ظلم سے مجھ کو پامال کر ڈالا میں اس کے قدموں کی خاک چومتا ہوں اور عذر خواہی کرتا ہوں

من نہ آنم کہ بجور از تو بنالم حاشا

بندۂ معتقد و چاکر دولت خواہم

میں وہ نہیں ہوں کہ کبھی تیرے ظلم سے گریہ وزاری کروں، میں وفادار خادم اور خیر خواہ غلام ہوں

آخر وہ رہا کر دیا گیا۔

رانا امر سنگھ والی اُدے پور شاہان مغلیہ کی ماتحتی نہیں قبول کرتا تھا۔ اکبر نے بھی بہت کوشش کی اور اس سے لڑائیاں کرتا رہا لیکن وہ قابو میں نہ آسکا ۱۰۲۲ھ میں جہاں گیر نے شاہزادۂ بلند اقبال خرم (بعد میں شاہ جہاں) کو رانا کی مہم پر بھیجا اور خود بھی اجمیر میں قیام کیا۔ وہاں زیادہ تر اپنا وقت شکار میں گزارتا تھا، اتفاقاً کہیں کلغی کا بیش قیمت الماس گر گیا۔ اس نے اس کو فال بد سمجھا۔ بہت پریشان ہوا اور دیوان حافظؔ سے تفاول کیا یہ شعر نکلا:

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد

دل رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

ایک ستارہ چمکا اور مجلس کا چاند بن گیا۔ میرے پریشان دل کو اس سے سکون

اوراطمینان حاصل ہوا

اللہ کی شان دوسرے ہی دن صبح کو وہ الماس مل گیا جس سے دل کو سکون ہوا۔

بعد ازاں یہ فال دیکھی کہ رانا زیر بھی ہو گیا نہیں، جواب ملا:

کنونکہ در چمن آمد گل از عدم بوجود

بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اب کہ چمن میں پھول کھلا۔ بنفشہ نے اس کے قدموں پر اپنا سر سجدہ میں رکھا

دو روز کے بعد خبر آئی کہ رانا نے خرم کی اطاعت قبول کی اور حاضر ہو کر قدم بوس ہوا۔

رانا کہ مہم سر کرنے کے بعد شہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ وہاں اس کو پندرہ مہینے کا عرصہ لگ گیا۔ جہاں گیر کو خرم کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ اس طویل مفارقت سے بے تاب ہو گیا۔ بیٹے کی واپسی کے لیے دیوان میں فال دیکھی، یہ شعر بر آمد ہوا۔

چشم بد دور کزاں تفرقہ خوش باز آورد

طالع نامور و دولت مادر زادت

چشم بد دور کہ اس جدائی کے بعد تیرا اچھا طالع اور خاندانی نصیبہ خوشی کے ساتھ تجھ کو واپس لایا

اس کے چند ہی روز بعد خرم کے دکن سے واپس ہو کر مانڈو کے قلعے میں جہاں گیر کی قدم بوسی حاصل کی۔ جہاں گیر نے اس موقع پر ہر چند ضبط کرنا چاہا۔ مگر محبت پدری کے جذبے نے تمکین و وقار کے پاؤں اکھیڑ دیئے اور بے ساختہ اٹھ کر بیٹے کو سینے سے لپٹا لیا۔ وہ خود اپنی تزک میں لکھتا ہے:

''بتاریخ یازدہم سن ہزار و بست و شش ہجری بعد از گذشتن سہ پہر و یک گھڑی درقلعہ مانڈو بمبارکی و فرخی سعادت ملازمت دریافت مدت مفارقت پانژدہ ماہ

دیازدہ روز کشیدہ بعد از تقدیم آداب و کورنش و زمین بوس بالائے جھروکہ طلبیدم واز غایت محبت وشوق بے اختیار از جائے خود برخاستہ در آغوش عاطفت گرفتم چندانکہ او درآداب وفروتنی مبالغہ نمود من درعنایت وشفقت افزودم ونزدیک حکم نشستن کردم۔''

صوبہ بنگال میں عثمان افغان نے جو ایک طاقت ور رئیس تھا۔سر اٹھا رکھا تھا۔ اکبر نے کئی بار اس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی لیکن قابو میں نہ آیا۔جہاں گیر کی تخت نشینی کے ساتویں سال پھر اس نے کچھ شورش کی۔جہاں گیر نے اسلام خاں صوبہ دار بنگال کو حکم بھیجا کہ اس کی اچھی طرح گوشمالی کی جائے۔

اسلام خاں اس وقت ڈھاکہ میں تھا، اس نے شجاعت خاں کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی۔عثمان نے بھی بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔اس لڑائی میں بہت سے جہاں گیری امراء کام آئے۔اثنائے جنگ میں عثمان کی پیشانی پر ایک تیر لگا، ہر چند کی زخم کاری پڑا لیکن اس نے کچھ پروانہ کی، برابر لڑتا رہا اور ساتھیوں کو جوش دلاتا رہا، لیکن زخم کی وجہ سے کمزور ہوتا جاتا تھا۔یہ کیفیت دیکھ کر اس کے ساتھی بھی ڈھیلے پڑ گئے اور میدان سے ہٹ گئے۔آدھی رات کو عثمان اسی زخم سے مر گیا۔باقی ماندوں نے اطاعت قبول کر لی اور ان کی جان بخشی ہوئی۔

جہاں گیر لکھتا ہے۔کہ اس مہم کے حکم دینے کے بعد میں نے خواجہ کے دیوان سے تفاول کیا تو فال نکلی۔

خوردہ ام تیر فلک بادہ بدہ تا سرمست
عقدہ در بند کمر ترکش جوز افگنم

میں نے تیر فلک کھایا ہ، مجھے شراب پلا دے تا کہ مست ہو کر میں جوزا کے ترکش کے بندھ میں گرہ ڈال دوں

پنڈت خوشگو اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ میرے دادا نے جب بڑھاپے کی وجہ سے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے وطن میں رہنا شروع کیا تو ان کا یہ معمول تھا

کہ روزانہ دیوان حافظ لے کر دریائے گنگا کے کنارے چلے جاتے اور وہاں ذوق و شوق کے ساتھ اس کو پڑھتے۔ اایک دن اتفاق سے ادھر سے ایک سادھو گزرا جو ایک پرانی گدڑی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا تم یہ کیا پڑھ رہے ہو، دوسرے دین کے لوگوں کی کتاب نہیں پڑھنی چاہیے۔ دادا نے جواب دیا کہ جس شخص کی یہ کتاب ہے وہ بڑے گیانی اور مہا پرش تھے۔ اس میں انھوں نے بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ سادھو بگڑا اور اس نے کہا گیانی نہیں خاک تھا، یہ کتاب پانی میں پھینک دو۔ دادا کو غصہ آیا۔ انھوں نے بگڑ کر کہا کہ تم ایسی باتیں نہ کہو، ہم سے تم سے وہ لاکھ درجہ بہتر تھے، ان کا ادنا کمال تو یہی ہے کہ جو بات چاہیں ان کی اس کتاب سے پوچھ لیں، وہ بتا دیتے ہیں۔ سادھو نے کہا: ''اچھا، دیکھو مجھے کیسا بتاتے ہیں۔'' یہ شعر نکلا:

بزیر دلق ملمع کمند ہا دارند
دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں

پیوند لگی ہوئی گدڑی کے نیچے بہت سی کمند رکھتے ہیں، ان چھوٹی آستین والوں کی دراز دستی تو دیکھو

یہ سننا تھا کہ اس نے خواجہ کو فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ دادا کو پھر تاب ضبط نہ رہی۔ انھوں نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ اس بدزبان کو خوب پیٹو اور ذرا بھی دریغ نہ کرو۔ اس نے پیٹنا شروع کیا مگر گدڑی بہت موٹی تھی، چوٹ نہ لگتی تھی، آخر اس نے ارادہ کیا کہ گدڑی اس کے بدن سے کھینچ لے، لپک کر کھینچنا تھا کہ نیچے سے آٹھ کمندیں برآمد ہوئیں، پھر تو اس کو گرفتار کر لیا۔

مرزا مہدی خاں نادر شاہ کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ جب نادر افغانوں کو پسپا کر کے عاق اور فارس پر قبضہ کر چکا تو اس کے ساتھ کے خراسانی لوگ اپنے وطن کو واپس جانا چاہتے تھے اور شاہ طہماسپ اس کو آذربائیجان بھیجنا چاہتا تھا، نادر متردد تھا کہ کیا

کرے۔ خواجہ کی قبر پر گیا اور وہاں جو دیوان رکھا رہتا ہے اس میں فال دیکھی۔ مندرجہ ذیل شعر نکلا:

عراق و فارس گرفتی بشعر خود حافظؔ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

حافظؔ عراق اور فارس تو اپنے شعروں سے تم نے فتح کرلیا، اب بغداد اور تبریز فتح کرنے کا وقت ہے، چلو

چنانچہ اسی کے مطابق اس نے حملہ کیا اور ترکوں کے ہاتھ سے تبریز اور بغداد کو چھین لیا۔

غازی پور میں مولوی عبدالصمد صاحب نے ایک نہایت معزز وکیل اور بہت بڑے رئیس تھے، انھیں کے پڑوس میں زمانیہ کے ایک پٹھان رہتے تھے، بیچارے فقر و فاقہ سے بہت تنگ تھے۔ پہلے وہ بستی کے ضلع میں کسی کچہری میں ملازم تھے، مگر کوئی وجہ ہوگئی جس سے وہ نوکری جاتی رہی۔ عیال دار آدمی، سخت پریشان تھے، کوئی صورت گزارے کی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک دن اپنی مصیبت کے خیال سے بہت تنگ دل تھے کہ یاالٰہی! کس طرح کام چلے گا، کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دیوان حافظؔ میں فال دیکھی، یہ شعر نکلا:

شد لشکر غم بے عدو از بخت میخواہم مدد
تا فخر دیں عبدالصمد باشد کہ غم خواری کنند

غم کا لشکر بے حد ہوگیا، میں اپنے نصیبہ سے مدد چاہتا ہوں ممکن ہے کہ فخر دیں عبدالصمد میری غم خواری کریں

گو مولوی عبدالصمد صاحب سخاوت اور شرفا نوازی میں بڑے نیک نام تھے لیکن پٹھان آدمی اور کبھی کا کوئی تعلق مولوی صاحب موصوف سے تھا نہیں۔ ان کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر آخر دل کے تقاضے سے جانا پڑا۔ انھوں نے جب

ان کا حال سنا تو بہت ترس کھایا اور کوشش کر کے ان کو کچہری میں نوکر رکھا دیا۔

ہمارے ایک دوست غلام احمد صاحب قادیانی کے ماننے والوں میں سے تھے۔ اکثر ہمارے پاس آتے ۔ان سے اسی قسم کی مذہبی باتیں رہتیں ۔ایک دن کہنے لگے کہ دیکھو تو خواجہ حافظ مرزا صاحب کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا آپ ایمان لائے ہیں اور پھر شک کرتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں، شک نہیں کرتا، بلکہ مجھ کو تو فالوں پر کوئی اعتقاد بھی نہیں ہے۔ یوں ہی کہتا تھا کہ دیکھو، میں نے دیوان کھولا، خواجہ نے کہا:

نیست در دائرہ جز نقطہ خلاز از کم و بیش

کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرا سے بینم

دائرے میں سوائے نقطہ کے کوئی چیز ذرا بھی خلاف نہیں ہے اور میرے نزدیک یہ مسئلہ بالکل واضح ہے

کہنے لگے کہ میں کچھ نہ سمجھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مرزا صاحب اسی دائرے میں گردش کرتے ہیں جو اسلام کا ہے۔ قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں، نبیؐ پر ایمان رکھتے ہیں، انؐ کی حدیثوں پر عمل کرتے ہیں۔ غرض اعتقاد اور عمل ہر لحاظ سے وہ اسلام کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ مگر اس دائرے میں صرف ایک نقطہ غلط ہے اور وہ مرزا صاحب کی ذات ہے، یعنی جب اسلامی تعلیمات پر وہ چلتے ہیں اور اسی پر چلنے کی لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں تو پھر اپنی ذات کو کیوں بیچ میں لاتے ہیں کہ مجھ کو مسیح مانو، مہدی مانو، کرشن مانو، یہ خود غرضی ہے اور یہ ہی نقطہ اس دائرے میں غلط ہے۔ایک مسلمان عالم کی طرح اسلام کی ہدایت لوگوں کو کریں اور اپنی شخصیت کو بیچ میں نہ لائیں تو کچھ قباحت نہیں۔

جنگ روس و جاپان میں جب بحیرہ بالٹک کا بیڑہ جاپان سے لڑنے گیا ہے تو

تمام دنیا منتظر تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

مہینوں انتظار میں گزر گئے اور ابھی تک بیڑہ نہیں پہنچا۔ ہمارے ایک دوست نے اس بیڑے کے متعلق فال دیکھی یہ شعر نکلا:

ز گریہ مردم چشمم نشستہ در خون ست

بی بیں کہ در طلبت حال مردماں چونست

روتے روتے میری آنکھیں خون میں ڈوب گئی ہیں، دیکھ کہ تیری جستجو میں پتلیوں کی کیا حالت ہوگئی ہے۔

یہ شعر پڑھتے ہی ہمارا پنجابی دوست بے ساختہ پکار اٹھا ''روس دا بیڑہ غرق'' آخر میں اس کا انجام بھی یہی ہوا۔

فالیں ابھی بہت سی ہیں، کہاں تک لکھوں۔ ان کے لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے اور طبیعت گھبرا گئی اس لیے اب ختم کرتا ہوں۔

------The End--------ختم شد----------